رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

ربیع الاول ۱۳۷۴ھ جلد ۴۳ عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ ۔ لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے قیمت فی پرچہ دس آنے

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابو الاعلی مودودی صاحب

جلد اول (طبع دوم)

سورۃ فاتحہ تا الانعام

قرآن پاک کا عام فہم سلیس اردو ترجمہ و تفسیر مع عربی متن قرآن حکیم کے فطری طرز استدلال اور اسکی جامعیت پر حکیمانہ تبصرہ غیر اسلامی زندگی پر سائینٹفک تنقید ۔ مدلل تشریح و تعبیر

دل نشین انداز بیان

اہم مسائل ۔ فلسفہ ۔ قوانین حیات کی مجتہدانہ وضاحت غیر اسلامی نظام ہائے حیات کے مد مقابل نظام اسلامی کا

مکمل اور جامع نقشہ

سابق کتب مقدسہ کے حذف و اضافہ کی نشاندھی' اسلام اور جاہلیت کی تاریخی کشمکش پر بے لاگ تبصرہ' ان خصوصیات کے ساتھ بصیرت افروز مقدمہ ۔ سورتوں کے عنوانات ان کا زمانہ نزول اور پس منظر ربط آیات

جغرافیہ قرآن کے متعدد تاریخی نقشہ جات ۔ فہرست موضوعات بہترین کتابت ۔ عمدہ کاغذ و طباعت ۔ خوشنما مضبوط جلد سائز $\frac{22 \times 29}{8}$ ضخامت پونے ساتسو صفحات

ہدیہ !

قسم اول مع بکس ۔ ۱۲ ۲۰ علاوہ
قسم دوم ,, ۔ ۴ ۱۸ محصولڈاک
قسم سوم بغیر بکس ۔ ۔ ۱۱ وغیرہ

ایک روپیہ چار آنہ

خصوصی جلدیں !

قسم سوم ۱۱/۸' ۱۳/۴ اعلیٰ مکینیکل کاغذ
قسم دوم ۲۰/۱۲' ۲۲/۰۲' مطلا کنارہ -/۲۹
مطلا جلد و کنارہ -/۳۱' ۲۴/۱۲
قسم اول ۲۲/۱۲' مطلا کنارہ -/۳۱ مطلا
جلد و کنارہ -/۳۳

جلد دوم (طبع اول)

سورۃ الاعراف تا بنی اسرائیل

تفہیم القرآن جلد دوم کیلئے ملک کے گوشہ گوشہ سے دریافت کیا جا رہا ھے اس کی طباعت میں تاخیر کا باعث کاغذ کی کمیابی کے سوا کچھ نہیں ۔ امپورٹ کردہ کاغذ کا کچھ حصہ پہنچ چکا ھے ۔ مزید جلد پہنچنے والا ھے طباعت شروع ہوتے ہی اعلان کردیا جائیگا ۔

جس ترتیب سے ہمارے ہاں فرمائشیں درج ہو رہی ہیں ۔ اسی ترتیب سے تعمیل کی جائیگی اگر فرمائش درج نہیں کرائی تو آج ہی اپنی فرمائش تحریر فرماویں ۔

ناظم مکتبہ

ناشر مکتبہ تعمیر انسانیت ۲۵۰ گوجر گلی موچی دروازہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	ربیع الاول ۱۳۷۴ھ ۔ مطابق دسمبر ۱۹۵۴ء	جلد ۴۳

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دین انسان کی فطرت کے کسی تقاضے کا جواب اور اس کی زندگی کی کسی حقیقی ضرورت کی تکمیل ہے، یا یہ ایک غیر ضروری بوجھ ہے جسے انسان کسی غلط فہمی کے زیر اثر کندھوں پر لادے چلا آرہا ہے؟ اگر یہ ایک غیر ضروری بوجھ ہے تو یہ اس قابل ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اسے اتار پھینکا جائے۔ اگر یہ کسی حقیقی تقاضے کا جواب اور کسی واقعی ضرورت کی تکمیل ہے پھر اسے اس کے تقاضے اور اس کی ضرورت کی وسعت و اہمیت کے مطابق انسانی زندگی میں مناسب مقام حاصل ہونا چاہیے!

وہ ضرورت کیا ہے؟ وہ تقاضا کونسا ہے؟

یہ سوال دل میں لیے جب ہم اپنے گرد و پیش کی دور دور تک پھیلی ہوئی دنیا پر پہلی ہی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ سارا عالم نور و ظلمت اور یہ تمام جہانِ رنگ و بُو بہترین نظم سے آراستہ اور بہترین آئین سے مالا مال ہے۔ یہ بے آئینی اور بدنظمی اور بے ترتیبی اور اندھیر گردی کی تماشا گاہ نہیں۔ مادے کی تمام کی تمام گوناگوں اشکال کشش و ثقل، سکون و حرکت، حرارت و برودت، قوت اور انرجی، لامعیت و اشعاعیت، نشو و نما، تغیر و حدوث اور عمل و ردِ عمل کے اٹل قوانین کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ قطرے اور سمندر، ذرات اور سورج، درخت اور پہاڑ، چیونٹیاں اور ہاتھی سب کے سب کوئی جنبش کیے بغیر نظم و ضبط کا جُوا اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی نگری ہے جس کی کوئی تعمیر مقررہ نقشے سے گھٹی بڑھی ہوئی نہیں ہے، ہر چیز اپنے صحیح استعمال کے لیے وقف ہے، پروگرام کے اوقات قطعی طور پر معین ہیں، حرکت کے لیے راستے بنے بنائے ہیں اور موجودات

کی گاڑیاں ان سے بال برابر اِدھر اُدھر نہیں ہوتیں، ٹریفک کے قواعد مقرر ہیں اور کوئی حرکت کرنے والا ان قواعد کی خلاف ورزی نہیں کرتا، ہر کسی کے حدودِ عمل کو باہدگر الگ کر دیا گیا ہے، قوتیں اور فرائض تقسیم کر دیئے گئے ہیں چنانچہ بڑے سے بڑے وجود اور چھوٹے سے چھوٹے اجسام یک جا رہتے ہیں مگر کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا، تیز سے تیز اور سست سے سست رفتار پر موجودات کی بھاری بھرکم گاڑیاں بیک دم اربوں کی تعداد میں ایک دوسرے کے متوازی اور ایک دوسرے کو کاٹنے والے راستوں پر دوڑ رہی ہیں، اور لاکھوں برس سے دوڑ رہی ہیں مگر بغیر کسی خلل کے یہ دور جاری ہے۔ ٹھوس اجسام اور مائعات اور گیسوں کی دنیا میں ایک دوسرے میں بالکل گتھی ہوتی ہیں مگر گڑبڑ نہیں ہوتی۔ جمادات اور نباتات اور حیوانات کے مختلف الاحوال عالم ایک دوسرے پر چھائے ہوئے ہیں مگر صلح و سلامتی سے نبھاؤ ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس بستی کی ساری رونق آئین کا کرشمہ ہے، اس بزم کی ساری ہماہمی نظم کا عطیہ ہے اور اس گھر کی ساری آبادی ہدایت کے دم قدم سے ہے! جس طاقت نے موجودات کو خلق کیا ہے، اُس نے آئین اور نظم بھی مقرر کیا ہے، اُس نے اُن کو ہدایت بھی دی ہے! یہی ہدایت ہر وجود کا "دین" ہے! کائنات کی بقا ہدایت، اور اس کے خالق کی ہدایت پر منحصر ہے، موجودات کا نشو و ارتقا دین، اور ان کے خالق کے دین پر دار و مدار رکھتا ہے۔ یہاں جو چیز پیدا ہوتی ہے اپنی ہدایت اور اپنا دین ساتھ لے کے آتی ہے، یہاں مادہ کی جو نئی شکل بھی ظہور پاتی ہے اپنے لیے ضابطہ اور آئین گلے میں آویزاں کیے ہوئے نمودار ہوتی ہے، یہاں جو قوت بھی ابھرتی ہے اپنی پیشانی پر اپنا پروگرام لکھا کے لاتی ہے۔

جمادات کو دیکھیے تو ان کی ہدایت کا ذریعہ طبعی جبریت ہے، نباتات کا مطالعہ کیجیے تو فطرتِ نامیہ کو ان کی رہنمائی پر مامور پائیں گے، حیوانات کا جائزہ لیجیے تو جبلت ان پر ضابطۂ عمل واضح کرنے کے لیے سرگرمِ کار ملے گی! لیکن انسان کا معاملہ موجودات کے ان تینوں خانوادوں سے کچھ دور تک تو ہم آہنگ رہتا ہے! لیکن جہاں سے اس کی شعوری اور ارادی زندگی کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں سے بالکل نئی صورتِ حالات سامنے آجاتی ہے۔ انسانی زندگی کا ایک دائرہ ہے جہاں طبعی جبریت اپنا فرض ادا کرتی ہے، پھر

ایک دائرہ ہے جس میں فطرت نامیہ کام کرتی ہے، پھر ایک اور دائرہ ہے جس میں حیوانی جبلت کا پارٹ سلامتی آتا ہے۔ لیکن ان دائروں سے آگے جب اخلاقی و اجتماعی میدان کا شروع ہو جاتا ہے تو یہ تینوں رہنما قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور ہر ایک معذرت کرتی ہے کہ اب اگر میں یک سر مُو بھی آگے بڑھوں تو پَر جلتے ہیں!

سوال یہ ہے کہ کیا یہ شعوری، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کا دائرہ ایسا ہے کہ اس میں ہدایت امر دین کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

یہ لکیر ہے کہ جیسے پھاندتے ہی انسان کو ارادہ و اختیار کی گراں بہا ذمہ داری سے نوازا دیا جاتا ہے یعنی اب کوئی قوت کشاں کشاں زندگی کو کسی لگے بندھے راستے پر بطور جبریت نہیں لے جائے گی، دوسرے لفظوں میں اب یک دم کئی راستے سامنے ہونگے اور ان میں سے راہِ حق اور صراطِ مستقیم کا انتخاب کرنا ہوگا، ہر قدم پر دوراہے اور چوراہے پیش آئیں گے اور اپنے ارادے سے کسی ایک پر سوچ سمجھ کر قدم بڑھانا ہوگا کہ کونسی راہ فلاح کی منزل کی طرف جانے والی ہے!

یہ ارادہ و اختیار انسان کو جس پوزیشن میں لاکے کھڑا کر دیتا ہے وہ بڑی پیچیدہ پوزیشن ہے۔ وہ یک وقت اپنے آپ کو طبعی ماحول اور اپنی ضروریات کی کشمکش میں بھی مبتلا پاتا ہے، اپنی خواہشات اور جذبات اور اپنی عقل کے درمیان بھی ہر لحظہ ایک نئے تصادم سے دوچار ہوتا ہے، قریب کے فائدوں اور نقصانات اور دُور کے نتائج اعمال کے درمیان گھِر کر بھی وہ بُری طرح اُلجھتا ہے، وہ اپنی ذات کی خود غرضانہ حس اور معاشرے کے اجتماعی تقاضوں کے درمیان بھی رسّہ کشی پاتا ہے، وہ قدامت پسندی اور جدت پرستی کی اونچ نیچ سے بھی دوچار ہوتا ہے، وہ افراط و تفریط اور عمل اور ردّ عمل کے تند اثرات کی زد پر بھی آتا ہے۔ شعور و اختیار کی زندگی ان اُلجھنوں سے اِس طرح بھری ہوئی ہے کہ آدمی کو جیسے ایک گھنے جنگل میں کھڑا کر دیا گیا ہو جہاں اونچے اونچے درخت سائیں سائیں کر رہے ہوں، کانٹے دار جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہوں، سر سے اونچی گھاس چاروں طرف سے گھیرا ڈالے ہوئے ہو، طرح طرح کی بیلیں جال پھیلائے ہوئے ہوں اور جہاں کہیں کوئی خلا دکھائی دے، یہی گمان ہو کہ بس راہِ نجات یہی ہوگی۔ اُلجھنوں کے اس جنگل میں اہوائے نفسانی درندوں

کی طرح ہونکتی پھرتی ہوں، جذبات کے ناگ پھنکار رہے ہوں اور شیطان وساوس کے غول کے غول دہاں اتار رہے ، زندگی کو اپنا شکار بنا لینے کے لیے پوری مدابیر لڑا رہا ہو۔

انسان کے پاس حواسِ خمسہ موجود سہی مگر وہ تو صرف گرد وپیش کے عالمِ مادّی کے خواص سے آگاہ کر کے بس کر دیتے ہیں، عقل کا ایک ٹمٹما تا دیا بھی روشن سہی مگر وہ تو اسی تیل سے روشن ہے جو حسّی علم سے فراہم ہوتا ہے، قیاس آرائی کی صلاحیت کار فرما سہی مگر یہ صلاحیت ہزار گھوڑے دوڑانے کے بعد بھی منزلِ یقین و آگہی تک تو نہیں پہنچاتی، یہ بھی تو کبھی گمان کی ایک پگڈنڈی کی طرف اشارہ کرتی ہے، کبھی دوسری کی طرف اور کبھی تیسری کی طرف!

یہ پوزیشن ہے جہاں سیکولر فلسفے انسان کو لا کے کھڑا کر دیتے ہیں کہ جا بیٹا چڑھ جا سولی پر رام بھلی کریگا۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ کیا یہ ساری کائنات اسی امر کی گواہی دیتی ہے کہ اس کا خالق خلق کر دینے کے بعد مخلوق کو ہدایت دیئے بغیر الجھنوں کے جنگل میں لاوارث چھوڑ دیتا ہے کہ جاؤ مرو یا جیو، مجھے کوئی واسطہ نہیں! وہ کہ جس کو مٹی کے ایک حقیر ذرّے تک کی بقا کی فکر ہے، جو گھاس کی ایک بے قیمت سی پتی کے نشوونما کا اہتمام کرتا ہے، جو ایک مچھر اور مکھی کے امن کا سروسامان کرتا ہے، جو ایک بیل اور گدھے کے لیے لا اینڈ آرڈر مقرر کرتا ہے، کیا انسان جیسی اعلیٰ ترین مخلوق ہی اس کی نگاہ میں ایسی بے وقر ہو کے رہ گئی ہے کہ اس نے اسے بالکل عاق کر دیا ہو کہ جاؤ جہنم میں، تمہارے لیے میرے پاس کوئی رہنمائی نہیں، ضابطہ نہیں، ہدایت نہیں، دین نہیں!

اس بات کے ماننے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ سرے سے خدا کے ہونے کا انکار کر دیا جائے لیکن خدا کو مان کر اس کا یہ تصور باندھنا کہ وہ مخلوق تو پیدا کرتا چلا جاتا ہے، لیکن اس کو زندگی کی راہِ فلاح بتلانے کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا، کسی معقول انسانی ذہن کو سجتا نہیں! کوئی اور اس تصور کو پیش کرتا ہو تو کرے، اسلام ایسے خدا کا تصور نہیں دلاتا۔ دوسرے انسان اسے قبول کر سکتے ہوں تو کریں، کسی مسلمان کا ذہن اسے قبول نہیں کرتا۔

انسانی ارادہ و اختیار کا راستہ عمل کی جن پیچ در پیچ وادیوں سے ہو کر جاتا ہے وہ تقاضا کرتی ہیں کہ اس کی رہنمائی کا کوئی سروسامان ہو اور چونکہ اس کی زندگی شعوری زندگی ہے اس لیے اس کی رہنمائی بھی شعوری ہو۔ اس کو ہدایت دی جائے اور اس کی عقل کو خطاب کر کے دی جائے۔ اسے دین بہم پہنچایا جائے اور اس کے ارادہ و اختیار کی اپنی رضامندی حاصل کر کے پہنچایا جائے۔

وہ ایک ہدایت کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے طبعی ماحول اور اس کے تقاضا ہائے نفس کے درمیان کشمکش ہو تو وہ جان سکے کہ کہاں تک اسے آگے بڑھنا ہے اور کس صورت میں اسے پیچھے ہٹنا چاہیے وہ ایک ضابطے کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی خواہشات اور اس کی عقل کے درمیان رسہ کشی ہو تو وہ دونوں کو کس متعین نقطے پر جمع کرے۔ وہ ایک قانون کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کے سامنے مختلف آراء اور اقدامات اور لائحہ ہائے عمل قریبی نتائج اور دور کے نتائج کو پیش کر کے الجھن میں ڈالیں تو وہ کس کے مقابلے میں کس کا انتخاب کرے۔ وہ ایک دین کا ضرورت مند ہے کہ جب اس کی ذات کی خودغرضیاں اور اس کے معاشرتی ماحول کے تقاضے بیک وقت اس پر دباؤ ڈال رہے ہوں تو وہ اپنے آپ کو کس موقف پر جمائے؟ وہ ایک معیارِ فیصلہ کا ضرورت مند ہے کہ جب قدامت اور جدت،، افراط و تفریط، عمل اور ردِعمل کے مختلف مؤثرات اس کی زندگی کے سامنے اپنے اپنے مطالبے رکھ رہے ہوں تو کسے وہ قبول کرے اور کسے رد کرے! وہ ضرورت مند ہے ایسی متعین حدود کا کہ خیر و شر کے معرکوں میں اسے معلوم ہو سکے کہ کہاں تک بڑھتے چلے جانا ہے اور کہاں پہنچ کر رک جانا ہے۔ وہ ضرورت مند ہے ٹریفک کے ایسے قواعد کا اور ایسے نشانات و علاماتِ راہ کا کہ جن کی پابندی میں وہ شہرِ حیات کے اندر افکار و اعمال کی گاڑیاں حادثوں کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر چلا سکے۔

انسان چونکہ ارادہ و اختیار رکھتا ہے، اس لیے وہ کسی دین اور ہدایت اور ضابطے کو صرف اسی صورت میں مان سکتا ہے جبکہ اس کے پیچھے کوئی ایسی اتھارٹی ہو جسے اس کی عقل واجب الاطاعت سمجھے۔ پھر ارادہ و اختیار ہی کی وجہ سے چونکہ وہ دین، ہدایت اور ضابطے میں دخل دینے اور تحریف اور ردّ و بدل کر دینے پر بھی قادر ہے ـــ اور اس کی خواہشات و جذبات کے تند ریلے ہر حد کو توڑ دینے کا موقع بھی

رکھتے ہیں، لہٰذا اس کی ضرورت ایک ایسا دین، ایک ایسی ہدایت اور ایک ایسا ضابطہ چاہتی ہے جس میں تقدس موجود ہو اور وہ ردّو بدل کے ارادے سے اس کی طرف انگلی بھی اٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ پھر اس کی فطرت "بیم و رجا" تقاضا کرتی ہے کہ اس کے لیے دین اور ضابطۂ ہدایت ایسا ہو کہ جس سے انحراف کرنا موجبِ سزا اور جس کی اطاعت کرنا ذریعۂ حصولِ جزا ہو۔ پھر چونکہ انسانی زندگی کو مختلف زمانوں، مختلف قسم کے ماحول اور مختلف حالات سے سابقہ پیش آتا ہے لہٰذا وہ ایسی رہنمائی کی ضرورت مند ہے جو ادلتے بدلتے حالات میں اسے یکساں کام دے سکے۔

یہاں تک ہم نے انسانی زندگی کے لیے دین کی جو ضرورت واضح کی ہے، ٹھیک اسی کا جواب ہے اسلام!

اسلام کے بالمقابل دوسرے کچھ مذہبی نظریے اور نظام بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا فکری تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرے سے اُس تقاضے اور اُس ضرورت کو پیش ہی نہیں کرتے جس کو پورا کرنے کے لیے انسان ایک دین چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ دین بہم پہنچانے کے بجائے محض ایک مذہب اور دھرم اور مَنتر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اُن میں کوئی ایسا ہے جو زندگی کو جبری عذاب قرار دے کر اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلانے والے وسیلے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، کوئی ایسا ہے جو روح کو سرور بخشنے کے لیے ایک مشروبِ مسکن، ایک نبیذِ خواب آور یا ایک بادۂ سرور بخش بن کر سامنے آتا ہے، کوئی ایسا ہے جو انسانی روح کے قطرے کو ذاتِ باری تعالیٰ کے سمندر سے جا ملانے کا پروگرام پیش کرتا ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ آدم کے گناہِ اول کے نتائج سے اولادِ آدم کو بچانے کی اسکیم سامنے رکھتا ہے۔ کسی نے انسان کی احتیاجِ ہدایت، اس کی تشنگیٔ دین اور اس کی طلبِ ضابطہ کا جواب بنا کر اپنے آپ کو متعارف نہیں کرایا اور نہ کاروانِ زندگی کی رہنمائی کی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی ہے!

ان مذہبی نظاموں نے ایک خدا، اور دو خداؤں، اور بے شمار خداؤں ـــــ اور ان کے علاوہ بے حد و حساب دیوتاؤں اور روحوں کا تصور انسان کو محض ایک روحانی تسکین کے لیے دیا ہے۔ انہوں نے اوہامی معتقدات کی بھول بھلیاں میں ڈال کر اسے حیرت زدہ اور مبہوت کرنے کی کوشش کی ہے۔

انہوں نے پوجا پاٹ، نفس کشی اور ترکِ دنیا کے ایسے اسالیب وضع کیے ہیں کہ آدمی ان کے اندر بھگتان بھگتتے ہوئے مگن رہے کہ وہ مایا کے جال، جیون کے عذاب اور گناہوں کے چکر سے نجات پانے کی قیمت ادا کر رہا ہے۔ انہوں نے قلب کو جلا دینے کے لیے کچھ محدود اخلاقی ضابطے بھی بنائے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے میل اترتا ہے اور روح اس قابل ہو جاتی ہے کہ ذاتِ باری میں جذب ہو جائے۔

بس اس سے آگے نہ مذاہب نے انسانی زندگی کے بارے میں کوئی ذمہ داری قبول کی ہے، نہ کوئی کمانڈ اور ہدایت سیاست و تمدن کے معاملات میں فراہم کی ہے۔ آخر جو مذاہب دنیا کو ملعون اور ترکِ دنیا کو ذریعۂ نجات قرار دیتے ہیں، وہ خود اس "ملعون دنیا" کے لیے پروگرام اور منصوبہ اور ضابطہ کیسے دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے سیاست و تمدن سے انسان کو بائیکاٹ کرنے کی تعلیم دی ہے وہ کیسے سیاست و تمدن کے لیے نقشۂ کار دنیا کے سامنے لا سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے زندگی کی ہماہمیوں کو ایک عقوبت اور ایک سزا اور گناہ کا ایک چکر قرار دیا ہے وہ کس منہ سے ان ہماہمیوں کے درمیان کھڑے ہو کر نوعِ انسانی کو روزمرہ مسائل میں رہنمائی دے سکتے ہیں۔ جن مذاہب نے دنیوی امارت و بادشاہت کے متعلق یہ خبر دی ہو کہ اس میں دلچسپی لینے والے "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہیں ہو سکتے اُن سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خود ہی دنیوی امارت و بادشاہت کے نظم و انصرام کا کوئی درس دے سکیں گے۔

اس طرح کے مذاہب نے صدیوں سے انسان کو عجیب اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ وہ اپنے معاملاتِ زندگی میں منہمک ہوتا ہے تو یہ اُسے ٹوکتے ہیں کہ خبردار! دنیا کے جنجال میں پڑ گئے تو خدا نہیں ملے گا۔ وہ خدا کی طرف ان کے بتائے ہوئے نقشے پر لپکتا ہے تو اس کا اپنا جسم کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی طبعی ضروریات اس کا منہ نوچتی ہیں، اس کے بال بچے بھوکوں مرتے ہیں، اس کا گھر اُجڑتا ہے، اس کا کاروبار تباہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دو قدم خدا کی طرف آگے چلتا ہے، پھر اپنے فطری تقاضوں کی کھینچا تانی کے زور سے اپنے دنیوی معاملات کی طرف چار قدم پیچھے پلٹتا ہے۔ پیچھے پلٹتا ہے تو احساسِ گناہ کا کانٹا ضمیر میں چبھتا ہے۔ وہ مذہب سے پوچھتا ہے کہ میرے لیے ان دنیوی معاملات میں کوئی رہنمائی ہے جو مجھے احساسِ گناہ سے نجات دلا سکے؟ اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اب یا تو وہ تمدن سے مستقل طور پر [illegible]

تزکیۂ نفس

آفاتِ علم

(از جناب مولانا امین احسن اصلاحی)

جس طرح کسی سرسبز و شاداب باغ پر کوئی آفتِ ارضی و سماوی نازل ہو جاتی ہے اور وہ تباہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ جس طرح لہلہاتی ہوئی کھیتی کو کوئی روگ لگ جاتا ہے جس سے وہ دفعۃً یا آہستہ آہستہ جھلس جاتی ہے۔ جس طرح ایک عالیشان عمارت نذرِ تغافل ہو جانے کے سبب سے یا کسی زلزلہ کی وجہ سے کھنڈر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس طرح ایک تنومند اور تندرست انسان کسی بیماری کا شکار ہو کر موت کے کنارے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح علم و معرفت کو تباہ کر دینے والی بھی بہت سی بیماریاں ہیں جو اگر اس کی جڑوں کو لگ جائیں تو پھر اس کو ختم کر کے ہی دم لیتی ہیں۔ ان آفتوں میں سے بعض اپنے مزاج کے لحاظ سے جلد اور تیز اثر کرنے والی ہیں اور بعض آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ بعض انفرادی حیثیت سے نمودار ہوتی ہیں، بعض وبائی بیماریوں کی طرح پھوٹ پڑتی ہیں۔ بعض عقل اور ذہن کی طرف سے نمودار ہوتی ہیں بعض اخلاق و عمل کی طرف سے بعض محض کاہلی اور بے پروائی سے پیدا ہوتی ہیں بعض جان، مال یا جامع لفظوں میں دنیا کی غیر معمولی محبت کے سبب سے۔ بعض بزدلی، پست ہمتی اور خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں اور بعض گھمنڈ، غرور اور خود پسندی اور انانیت کا۔ ان اعتبارات سے ان کے درجہ اور ان کی نوعیت میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے لیکن جہاں تک ان کے اثر اور نتیجہ کا تعلق ہے یہ سب انسان کو علمِ حقیقی کی دولت سے محروم کر دینے کی خاصیت میں بالکل یکساں ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہر انسان جو ایک مرتبہ علم کی نعمت پا کر اس سے محروم ہونے کے لیے تیار نہ ہو ان بیماریوں کی نوعیت اور ان کے علاج کے طریقوں سے اچھی طرح واقف رہے۔ اپنی صحت کی قدر کرنے والا

ایک شخص جتنا اہتمام ان بیماریوں سے واقف رہنے کے لیے کرتا ہے جو اس کی صحت کو برباد کر سکتی ہیں اس سے کہیں زیادہ ضروری علمِ حقیقی کے ایک قدرداں کے لیے ان آفتوں سے باخبر رہنا ہے جو اس کے علم کو غارت کر سکتی ہیں۔ ہر شخص اپنے خزانہ کی حفاظت کا اہتمام اس کی قدر و قیمت کے لحاظ سے کرتا ہے۔ اگر ایک شخص اپنی جسمانی صحت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو اس سے جو نقصان اس کو پہنچے گا وہ بیشتر اسی دنیا کی زندگی تک محدود رہے گا۔ لیکن اگر ایک شخص علمِ حقیقی کی نعمت کی حفاظت سے قاصر رہ جائے تو یہ ایک ایسا نقصان ہوگا جس سے اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ ان بیماریوں کی اس اہمیت کے سبب سے ہم یہاں ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

غفلت اور بے پروائی | ان بیماریوں میں سب سے زیادہ عام بیماری غفلت اور بے پروائی کی بیماری ہے۔ انسان کا کچھ خاصہ سا ہے کہ جو چیز اس کے پاس موجود ہو اس کی قدر آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں میں کم ہو جاتی ہے اور جس چیز کی قدر کم ہو جائے لازماً اس کے رکھ رکھاؤ میں بھی فرق آجاتا ہے۔ اور جب ایک چیز کے رکھ رکھاؤ میں فرق آیا تو پھر ناگزیر ہے کہ اس چیز پر تغافل کا سایہ پڑنا شروع ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ اس پر ایک دن ایسا آئے کہ بالکل ہی عدم کی تاریکی چھا جائے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نسیان کو علم کی سب سے زیادہ عام آفت قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے آفۃ العلم النسیان (علم کے لیے بڑی آفت بھول جانا ہے)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق (جو علمِ حقیقی کا خزانہ ہے) آپ نے خاص طور پر یہ ہدایت فرمائی ہے کہ لوگ اپنے قرآن کے علم کو برابر تازہ کرتے رہیں تاکہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:-

تعاھدوا القرآن فانہ اشد تفصیا من صدور الرجال من النعم (متفق علیہ)	اپنے علمِ قرآن کو برابر تازہ کرتے رہو جس طرح اونٹ غفلت کے سبب سے کھو جاتا ہے اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ قرآن سینوں سے نکل جایا کرتا ہے۔

دوسری روایت میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:-

مثل صاحب القرآن کمثل صاحب الابل	اس شخص کی مثال جس کے پاس قرآن کا علم ہو اس شخص

المعلقة ان عاهد علیھا امسکھا وان اطلقھا ذھبت ۔

کی ہے جس کے پاس بندھنوں میں بندھے ہوئے اونٹ ہوں۔ اگر وہ ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے تو وہ محفوظ رہتے ہیں اور اگر وہ ان سے غافل ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہیں کے کہیں چل دیتے ہیں۔

یعنی علم کے لیے صرف ایک مرتبہ حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو حاصل کر لینے کے بعد بار بار اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا بھی ضروری ہے ورنہ اس کی مثال ایسی ہو گی کہ ایک شخص کسی دور دراز ولایت سے صرف کثیر اور اہتمام و انتظام کی تمام زحمتیں جھیل کر ایک قیمتی پودا منگوائے لیکن منگوا چکنے کے بعد پھر اس کی خبر نہ لے کہ وہ کس حال میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو پودا جس قدر قیمتی ہوتا ہے وہ اسی قدر رکھ رکھاؤ اور اہتمام کا طالب ہوتا ہے اور اگر یہ چیز اس کو حاصل نہ ہو سکے تو پھر اس کا نشو و نما پاتا تو درکنار اس کا محفوظ رہنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہی حال علمِ حقیقی کا ہے۔ جہاں تک اس کے حاصل ہونے کا تعلق ہے اس کا راستہ ہر طالب کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جس طرح آسمان سے بارش برستی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اپنی یہ سب سے بڑی نعمت بھی برسائی ہے اور اس کے نبیوں اور رسولوں اور اس کے صالح بندوں نے اس نعمت کے تقسیم کرنے میں تاریخ کے کسی دور میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور اس علم کو بقدر استعداد پایا بھی بہتوں نے ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی دیکھ بھال اور اس کے رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے اس ذمہ داری کے ادا کرنے میں بہت تھوڑے ہی پورے اترے ہیں اور درحقیقت یہی تھوڑے سے پورے اترنے والے ہیں جو اس نعمت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں ورنہ بہتوں کے لیے، جیسا کہ بعض حدیثوں میں فرمایا گیا ہے، یہ علم مفید ہونے کے بجائے ان کے خلاف ایک حجت ہی ثابت ہوا ہے۔

یہی سبب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کے لیے خاص اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید کی بعض آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل امین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی آیتیں سناتے تو آپ اس اندیشہ سے کہ کوئی چیز یاد کرنے سے رہ نہ جائے اس کو بار بار دہراتے اور اس کو اچھی طرح محفوظ کرنے کی کوشش فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فکر سے فارغ کر دینے کے لیے

قرآن مجید کو جمع کرنے اور اس کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری خود لے لی اور آپ کو ان الفاظ میں تسلی دی :-

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ - فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (سورہ قیمہ)

تم اس کو (قرآن کو) جلد حاصل کر لینے کے لیے اس پر اپنی زبان نہ چلاؤ۔ ہماری ذمہ داری ہے اس کو محفوظ کرنا اور اس کو سنانا۔ سو جب ہم اس کو سنائیں تو تم اس سنانے کی پیروی کرو۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اسکی وضاحت کرنا۔

یہ قرآن کو محفوظ رکھنے کا مقصد ہی ہے جس کی وجہ سے اس کو ایسے اسلوب میں ڈھالا گیا کہ اس کو یاد رکھنا آسان ہو اور پھر اس کی بار بار تلاوت کا حکم دیا گیا اور پنجوقتہ نمازوں میں اس کی تلاوت کو ضروری قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں رمضان کی راتوں میں خاص اہتمام کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لیے یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ٹھہرایا گیا کہ مساجد میں قرآن پڑھا جائے اور عام لوگ اس کو سنیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرض اور نفل نمازوں کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی قرآن کی تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ یہی حال صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا۔ قرآن کا جتنا جتنا حصہ اترتا جاتا اور جس جس کو پہنچتا جاتا وہ اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا۔ یہ اہتمام صرف قرآن کے الفاظ ہی کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں تھا بلکہ الفاظ سے زیادہ اس کے معانی و مطالب کے محفوظ کرنے کے لیے صحابہؓ میں سرگرمی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ صحابہؓ اپنے زمانہ میں مختلف علمی مجلسیں قائم کرتے تھے جن میں قرآن مجید کے معانی و مطالب اور اس کے اسرار و حقائق پر گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ ان حلقوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی شرکت فرماتے تھے اور تحقیق قرآنی کی ان مجلسوں کو آپ ذکر و عبادت کی مجلسوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

قرآن اور علومِ نبوی کو محفوظ کرنے کا یہی ذوق و شوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کے زمانوں میں بھی باقی رہا۔ خلفائے راشدین خود اس دلچسپی کو بڑھانے میں حصہ لیتے رہے خصوصیت کے ساتھ حضرت عمرؓ نے اس خدمت میں جو حصہ لیا اس کے ذکر سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کے لیے حفاظت کا یہ اہتمام پچھلی امتوں کے زمانوں میں نہ ہو سکا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا اور یہ امتیں اللہ تعالیٰ کی روشنی پانے کے بعد

ان سے محروم ہو گئیں۔ چنانچہ یہود کا جو حال ہوا اس کی مثال قرآن نے یہ دی ہے :۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۔
(۱۷ ۔ بقرہ)

ان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، جب آگ نے اس کے ارد گرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی اچک لی اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا جہاں ان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

انہی یہود کے متعلق فرمایا ہے کہ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِنْهُمْ (۱۳ ۔ مائدہ) "اور جس چیز کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ انہوں نے فراموش کر دیا اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے مطلع ہوتے رہو گے"۔

اسی طرح نصاریٰ کے متعلق قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کا ایک حصہ اپنی ناقدری اور بے پروائی کے سبب سے فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کی مستقل بنیادیں قائم ہو گئیں جن کے رفع ہونے کی اب ان کے پاس کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ گئی۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ
(۱۴ ۔ مائدہ)

اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا کہ ہم نصرانی ہیں ہم نے ان کا عہد لیا تو وہ بھلا بیٹھے ایک حصہ اس چیز کا جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی قیامت تک کے لیے۔

خواہشات نفس کی پیروی | دوسری چیز جو علم حقیقی سے محروم کرنے والی ہے وہ خواہشات نفس کی پیروی ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح اتباعِ ہوا ہے۔ اتباعِ ہوا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ضروریات کی تکمیل، اپنی خواہشات کے حصول، اپنی شہوات کی تسکین اور اپنے جذبات کی تسلی کے سوا اور کسی چیز سے کوئی سروکار نہ رکھے۔ ان کے سوا اس کے سامنے زندگی کا کوئی اور اعلیٰ اور بلند تر

مقصد نہ رہ جائے۔ وہ انہی چیزوں کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھ بیٹھے اور اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں اور اپنے تمام ذرائع و وسائل بس انہی کی خدمت اور مقصد براری میں لگا دے۔ ان کی لذتیں اور ان کے نقد منافع اس کو اس طرح مسحور کر لیں کہ اس کو یہ سوچنے کا کبھی موقع ہی نہ مل سکے کہ ان کے سوا کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے جو چاہی جا سکتی ہے اور یہ زندگی اس کے حاصل کرنے کا بھی ذریعہ بن سکتی ہے۔

اس اتباعِ ہوا کا ایک مرحلہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات و شہوات کی تعمیل میں اس قدر آگے بڑھ جائے کہ زندگی کے اندر وہ ان کے سوا یا تو کسی اور اعلیٰ اصول اور برتر قدر کا قائل ہی سرے سے نہ رہ جائے اور اگر قائل رہے بھی تو اپنے ان نفسانی مطلوبات کے حصول میں ان کا حارج ہونا کسی طرح گوارا نہ کرے۔ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے جب اٹھے تو اس چیز سے بالکل آنکھیں بند کر کے اٹھے کہ حرام و حلال اور ظلم و انصاف کے کچھ معروف ضابطے بھی ہیں جن کا اس کو احترام کرنا ہے۔ جب اس کے اوپر شہوت کا بھوت سوار ہو تو وہ صرف اس بات پر نگاہ رکھے کہ اس کی یہ شہوت کی آگ بجھتی کس طرح ہے، اس سے بالکل قطع نظر کر لے کہ اس کے لیے خدا اور رسول نے کچھ ضابطے بھی مقرر کیے ہیں جن سے تجاوز کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ جب اس پر کوئی جذبہ غالب آجائے تو وہ اس کے تقاضوں کی رو میں بہہ جانے کے لیے اپنے آپ کو اس کی موجوں کے حوالہ کر دے اس سے اسے کچھ بحث نہ رہے کہ یہ جذبہ بُرا ہے یا اچھا اور اس کے اندر اعتدال اور بے اعتدالی کی حدیں کیا ہیں۔ الغرض وہ ایک نرا حیوان بن جائے اور حیوانوں ہی کی طرح اپنی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرے، بس اگر کچھ فرق رہ جائے تو یہ کہ حیوانات کے لیے کچھ جبلی حدود ہوتے ہیں جن کی پابندی پر وہ مجبور ہوتے ہیں اس وجہ سے کسی راہ میں بھی قدرت کی مقرر کی ہوئی ایک متعین حد سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے اور یہ ایک خود مختار مخلوق ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں جس قدر آگے بڑھنا چاہے بڑھتا چلا جائے۔ یہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔

اس اتباعِ ہوا کا دوسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ آدمی صرف حلال و حرام کے حدود توڑنے ہی پر

قناعت نہ کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں اس قدر اندھا ہو جائے کہ ان کی خاطر تمام اقدار کو بدل ڈالنے کے درپے ہو جائے۔ اس کی کوشش یہ ہونے لگے کہ معروف منکر بن جائے اور منکر معروف کی جگہ حاصل کرے۔ جو چیز اب تک نیکی سمجھی گئی ہے وہ بدی سمجھی جانے لگے اور جو بدی ہے وہ نیکی کی حیثیت اختیار کرلے۔ قوم کی روایات، قوم کی تہذیب، اور قوم کے سارے معیارات یک قلم تلپٹ ہو جائیں۔ دین و مذہب کے نام سے جو چیز موجود ہے اس کا اول تو خاتمہ ہو جائے لیکن اگر خاتمہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کی وہ چیزیں جو کسی پہلو سے نفس کی آزادیوں میں خلل انداز ہوتی ہیں مٹا دی جائیں۔ ان میں سے بعض کو ملائیت اور دقیانوسیت کہہ کر ختم کر ڈالا جائے، کچھ پر تحریف کی قینچی چلا دی جائے۔ کچھ پر تاویل باطل کی سیاہی پھیر دی جائے۔ صرف انہی چیزوں کو باقی رہنے دیا جائے جو نفس کی خواہشوں کے مطابق ہیں یا کم از کم ان سے متصادم نہیں ہیں۔

انسان کی یہ کوشش اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی میں اس قدر بے بس ہو جاتا ہے کہ وہ اس بات کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں رہ جاتا کہ کسی گوشہ سے اس کے کانوں میں ملامت کی کوئی آواز پڑے۔ اسی وجہ سے وہ یا تو ان ساری چیزوں کو مٹا دیتا ہے جو اس کے نفس کو کھٹکتی ہیں یا ان کو تاویل و تحریف کے پردوں میں چھپا دیتا ہے تاکہ ان کے سبب سے اس کی نفس پرستی کی آزادی میں اس کا ضمیر کوئی خلش نہ محسوس کرے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کتر بیونت اور اتنی کاٹ چھانٹ کے بعد مذہب کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں کے کسی گوشہ میں اگر بچ رہتا ہے تو اس وجہ سے نہیں بچ رہتا ہے کہ وہ مذہب کا حصہ ہے، یا خدا نے اپنی کتاب میں اس کی تعلیم دی ہے، یا رسول نے اپنے قول اور فعل سے اس کو قائم کیا ہے۔ بلکہ اس کے بچ رہنے کی واحد وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی ہے یا کم از کم یہ کہ ان کے خلاف نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ قرآن اور حدیث کی کسی بات کو اس لیے ماننا کہ یہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہے یہ قرآن و حدیث اور اللہ اور رسول کو ماننا نہیں ہے بلکہ یہ محض اپنی خواہشوں کی پرستش ہے۔ خدا اور رسول کے ماننے کے لیے تو یہ لازمی ہے کہ ان کی ہر بات مانی جائے خواہ وہ ہماری خواہشوں کے مطابق ہوں یا ان کے خلاف۔

بلکہ ایمان کا حقیقی تقاضا تو خواہشوں کے خلاف ماننے ہی سے پورا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشیں میرے لائے ہوئے علم کے تابع نہ بن جائیں"۔

انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی بنائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں طرح کے رجحانات ودیعت کر دیئے ہیں۔ جہاں تک اس کی مادی ضروریات و خواہشات کا تعلق ہے وہ تو اس کو پوری طاقت کے ساتھ نفع عاجل اور لذت عاجل کی طرف کھینچتی ہیں اور اس کو ہرگز اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ان کی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کی اخلاقی قید و بند کو حائل ہونے دے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر کچھ روحانی تقاضے بھی ہیں جو اس کے ہر غلط اقدام پر اس کو ٹوکتے ہیں اور اس کی نفسانی خواہشوں کے علی الرغم اس کو نیکی، انصاف اور حق پرستی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف کھینچتے ہیں۔ انسان کی نفسانی اور روحانی کشمکش کا یہی وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کی دستگیری اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے انسان کو علم حقیقی کی روشنی عطا فرمائی ہے اور اس علم حقیقی کو "العلم" کی اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے اور انسان کی سعادت و کامرانی اس بات میں رکھی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام مراحل میں "ہوا" کی پیروی کرنے کے بجائے اس "العلم" کی پیروی کرے۔ اور اگر وہ اس "العلم" کے ہوتے ہوئے اپنے "اہواء" یعنی اپنی خواہشات، اپنے من گھڑت نظریات و افکار اور اپنے جی سے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کی (جو العلم کے خلاف ہوں)، پیروی کرتا ہے تو وہ اس قانون کی مخالفت کرتا ہے جو فاطر السموات والارض نے انسان کی فلاح و نجات کے لیے بنایا ہے اور اس صورت میں اس کو خدا کے قانون کی مخالفت کے برے انجام سے کوئی طاقت بھی نہیں بچا سکتی۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید کی یہ آیت واضح کر رہی ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ	اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے بعد اس کے کہ تمہارے پاس "العلم" آ چکا ہے تو اللہ کے مقابل میں

وَلَا وَاقٍ (۳۷- رعد) کوئی تمہارا کارساز اور بچانے والا نہیں بن سکے گا۔

اس "العلم" اور "ہوا" کی طبیعت میں ہر اعتبار سے بالکل تضاد ہے۔ ایک کا سرچشمہ وحی الہٰی ہے اور دوسرے کا منبع انسان کا اپنا نفس۔ ایک ہمیشہ انسان کو ابدی زندگی کی بلندیوں کی طرف بڑھنے کے لیے اشارہ کرتا ہے اور دوسری چیز اس کو اسی زندگی کی فانی لذتوں کی کیچڑ میں لت پت رکھنا چاہتی ہے۔ ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان مادی خواہشوں اور لذتوں کی تنگنائے سے نکل کر روحانی کمالات کے حاصل کرنے کے لیے پرواز کرے لیکن دوسرے کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انسان اسی زمین کا کیڑا بنا رہے۔ اس کوشش اور خواہش میں کچھ عرصہ تک کشمکش رہتی ہے بالآخر یہ کشمکش اس وقت ختم ہوتی ہے جب انسان ان میں سے کسی ایک کو مستقلاً اپنے لیے انتخاب کر لیتا ہے۔ اگر وہ برابر "العلم" کے مقابل میں "ہوا" ہی کو ترجیح دیتا ہے، بلندیوں پر چڑھنے کے بجائے پستیوں ہی میں گرے ہوئے رہنے کو پسند کرتا ہے، اور خدا کے بجائے اپنے نفس اور اس کی خواہشوں ہی کی رہنمائی پر اعتماد کرتا ہے اور اس پر دناءت اور رذالت اس قدر غالب آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو شر سے خیر کی طرف اور بدی سے نیکی کی طرف موڑنے کے لیے عسر اور یسر اور رنج و راحت کے جو امتحانات رکھے ہیں ان سے بھی وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ دونوں ہی صورتوں میں کتے کی طرح زبان نکالے ہی رہتا ہے تو ایسے لوگوں سے "العلم" کی نعمت سلب ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خواہشوں اور لذتوں کے حوالہ کر دیتا ہے کہ وہ ان کے پیچھے جن جن وادیوں میں بھٹکنا چاہتے ہیں اچھی طرح بھٹک لیں۔ قرآن مجید نے اسی صورت حال کی تصویر ایک تمثیل کے ذریعہ سے پیش کی ہے اور دیکھیے کس قدر جامع اور خوبصورت تمثیل ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ	اور ان کو سرگزشت سناؤ اس شخص کی جس کو ہم نے اپنی
اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ	آیتیں عنایت کی تھیں لیکن ان سے وہ بالکل کنارہ کش
مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ	ہو گیا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ پس وہ گمراہوں
اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ	میں سے ہو گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کے
كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ	ذریعہ سے اس کو بلند کرتے لیکن وہ برابر پستی ہی کی طرف

تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۔ (۱۷۶۔ الاعراف)

جھکا رہا اور اس نے اپنی خواہشوں ہی کی پیروی کی پس اس کی مثال بالکل کتے کی مثال ہے۔ اگر تم اس کو ڈانٹو ڈپٹو جب بھی اپنی زبان نکالے رکھے گا اور اگر چھوڑ دو جب بھی زبان نکالے رکھے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ نے یہود کی مثال بیان کی ہے جن کو "العلم" کی روشنی عطا ہوئی تھی لیکن انہوں نے اس روشنی کی قدر نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان ان کے پیچھے لگ گیا اور اس نے ان کو بالکل ہی ایمان سے محروم کر کے چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ ان آیتوں کی کمند کا سہارا لے کر روحانی بلندیوں کے مقامات طے کرنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کریں لیکن وہ برابر اپنی ہوائے نفس ہی سے چمٹے رہے اور اس قدر پست ہمت اور ذلیل ہو گئے کہ نہ خدا کی تنبیہات نے ان پر کچھ اثر ڈالا اور نہ اس کی عنایات نے۔ بالآخر جب وہ اس قدر ذلیل اور پست ہمت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے "العلم" کی روشنی ان سے چھین لی اور ان کو ان کے نفس کے حوالہ کر دیا۔

عدمِ احتساب علم حقیقی کو برباد کرنے والی آفتوں میں سے ایک بہت بڑی آفت عدمِ احتساب بھی ہے۔ عدمِ احتساب کے معنی یہ ہیں کہ آدمی نیکی اور بدی اور حق اور باطل کے معاملہ میں بالکل بے تعلق ہو کے رہ جائے۔ اسے اس سے کچھ بحث ہی نہ رہ جائے کہ دنیا نیکی کی طرف جا رہی ہے یا بدی کی طرف، خیر کی طرف بڑھ رہی ہے یا شر کی طرف، معاشرہ بگڑ رہا ہے یا بن رہا ہے۔ وہ یا تو یہ نظریہ قائم کر لے کہ یہ پرائے جھگڑے ہیں اور پرائے جھگڑے نمٹانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے یا فضا کی خرابی اور حالات کی ناسازگاری اس کو اس قدر پست ہمت اور بزدل بنا دے کہ صریح سے صریح انحراف کو دیکھ کر بھی اس کی زبان سے کلمۂ حق نہ نکلے۔ اگر کسی قوم کے اندر حاملینِ علم کی اکثریت یا ان کی پوری جماعت کی جماعت یہی روش اختیار کر لے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس قوم پر باطل کی تاریکی چھا جاتی ہے اور وہ علم حقیقی کے نور سے بالکل ہی محروم ہو جاتی ہے۔

کسی معاشرے کے اندر جس وقت خرابی کا آغاز ہوتا ہے تو یہ خرابی زیادہ طاقتور نہیں ہوتی۔ اگر اسی مرحلہ

میں معاشرے کے ذمہ دار لوگ اس کے احتساب کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور برائی کے ذمہ داروں کو مناسب تنبیہ ہو جائے تو اس کے مزید پھیلنے کے امکانات کا سدباب ہو جاتا ہے لیکن اگر اس سے تغافل برتا جائے تو آہستہ آہستہ وہی معمولی سی برائی جڑ پکڑ لیتی ہے اور پھر اس کے برگ و بار اس قدر پھیل جاتے ہیں کہ ان پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا ہے ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل　　چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

اس احتساب کے لیے قرآن کی معروف اصطلاح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہے۔ اگر اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے غفلت کی جائے تو اس کے نتائج کا پہلا مرحلہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ معروف منکر اور منکر معروف کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ اس کے بعد اس کا دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ طبیعتیں مسخ ہو کر بدی کے سانچہ میں اس طرح ڈھل جاتی ہیں کہ جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذمہ دار تھے وہ علانیہ بدی کا حکم دینے اور نیکی سے روکنے لگ جاتے ہیں۔ اس کا تیسرا مرحلہ یہ آتا ہے کہ علم حقیقی کی روشنی بالکل ہی غائب ہو جاتی ہے اور تمام معاشرے پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے کہ بڑے بڑے علم رکھنے والوں کی عقل بھی چکر کھا جاتی ہے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس فتنہ سے بھاگ کے کہاں جائیں اور کیا کریں۔ ان تمام مراحل کی تصویر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر کھینچ دی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کیف انتم اذا طغیٰ نساءکم وفسد شبابکم وترکتم جهادکم؟ قالوا وان ذالك لكائن يا رسول الله؟ قال نعم والذى نفسى بيده واشد منه سيكون۔ قالوا وما اشد منه يا رسول الله؟ قال كيف انتم اذا لم تامروا بالمعروف وتنهوا عن المنكر؟ قالوا

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہاری عورتیں بے قابو ہو جائیں گی، تمہارے نوجوان بدچلن ہو جائیں گے اور تم جہاد چھوڑ بیٹھو گے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ

او کائن ذالك یارسول الله ؟ قال نعم والذی نفسی بیده واشد منه سیکون۔ قالوا وما اشد منه؟ قال کیف انتم اذا رأیتم المعروف منکرا والمنکر معروفا۔ قالوا او کائن ذالك یارسول الله ؟ قال نعم والذی نفسی بیده واشد منه سیکون، قالوا وما اشد منه؟ قال کیف انتم اذا امرتم بالمنکر ونهیتم عن المعروف۔ قالوا او کائن ذالك یارسول الله قال نعم والذی نفسی بیده واشد منه سیکون، یقول الله تعالیٰ بی حلفت لاتیحن لهم فتنة یصیر الحلیم فیها حیران۔

اس سے زیادہ سخت مرحلہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نہ نیکی کا حکم دوگے اور نہ برائی سے روکو گے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے اس سے بھی سخت مرحلہ سامنے آنے والا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم دیکھو گے کہ معروف منکر بن گیا ہے اور منکر معروف بن گیا ہے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اور اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت مرحلہ آنے والا ہے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اس سے زیادہ سخت کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم برائی کا حکم دوگے اور بھلائی سے روکو گے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ کیا یہ بھی ہونے والا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اور اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے اس سے بھی زیادہ سخت وقت آنے والا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی ہے کہ اس وقت میں ان کے لیے ایسا فتنہ برپا کروں گا کہ بڑے بڑے دانشور بھی چکر میں پڑ جائیں گے۔

اس حدیث سے وہ پوری تدریج سامنے آجاتی ہے جس تدریج سے احتساب کے فرض سے غفلت نمایاں ہوتے ہی فتنہ کی تاریکی بڑھنی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس طرح چھا جاتی ہے کہ بڑے بڑوں کو بھی نیکی اور سچائی کی راہ سوجھائی نہیں دیتی اور آنکھیں رکھنے والے بھی اندھے بن جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا مضمون کی تائید بعض دوسری حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف و تنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عذابا من عندہ ثم لتدعنہ ولا یستجاب لکم (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یا تو تم نیکی کا حکم دوگے اور برائی سے روکوگے یا یہ ہوگا کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے ایک عذاب بھیجے گا، پھر تم اس کو پکاروگے لیکن تمہاری سنی نہیں جائے گی۔

ایک دوسری حدیث میں یہی حقیقت ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوئی ہے۔

ما من قوم یعمل فیہ بالمعاصی ثم یقدرون علی ان یغیروا ثم لا یغیرون الا اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب۔

جس قوم کے اندر برائی پھیل رہی ہو اور اس کے اندر ایسے لوگ ہوں جو اس کی اصلاح کرسکتے ہوں لیکن وہ اصلاح نہ کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقت قریب آلگا ہے جب اللہ تعالیٰ ان سب کو کسی عذاب میں پکڑے۔

ایک حدیث جو ٹھیک ٹھیک قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر ہے اس حقیقت کو یوں واضح کررہی ہے۔

ان اللہ تعالیٰ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروا فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ العامۃ والخاصۃ۔

اللہ تعالیٰ تھوڑے سے برے لوگوں کے برے اعمال کی پاداش میں دوسروں کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک یہ بات نہ پیدا ہوجائے کہ وہ اپنے درمیان برائی کو پھیلتے ہوئے دیکھیں اور وہ اس کے خلاف آواز اٹھانے پر قادر بھی ہوں لیکن وہ آواز نہ اٹھائیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے برے اور بھلوں سب کو سزا دے دیتا ہے۔

اس باب میں سب سے زیادہ اہم حدیث ذیل کی حدیث ہے جو نہایت واضح طور پر کھول دیتی ہے کہ اگر کسی قوم کے اہلِ علم احتساب کے فرض سے غافل ہو جاتے ہیں یا محض منافقانہ قسم کے احتساب پر قانع ہو جاتے ہیں تو کس طرح اللہ تعالیٰ ان کو علم و ایمان کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔

لما وقعت بنوا اسرائیل فی المعاصی نهتهم علماءهم فلم ینتهوا فجالسوهم فی مجالسهم وآکلوهم وشاربوهم فضرب الله قلوب بعضهم ببعض فلعنهم علی لسان داؤد وعیسی ابن مریم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بنی اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہونے لگے تو ان کے علماء نے شروع شروع میں ان کو روکا لیکن جب وہ باز نہ آئے تو بالآخر انہوں نے ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک گروہ کے دلوں کی سیاہی دوسروں کے دلوں پر تھوپ دی اور حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی زبان سے ان پر لعنت کر دی گئی۔

بدعت علم حقیقی کو برباد کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز بدعت بھی ہے۔ بدعت کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز اللہ کے دین میں نہیں ہے اور نہ اس کے مزاج سے کوئی مناسبت ہی رکھتی ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ شریعت میں اصل و اساس کی حیثیت صرف اس چیز کو حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طریق پر ثابت ہے۔ اس کے بعد شریعت کے اندر اگر کسی چیز کو سمجھا جا سکتا ہے تو اس چیز کو سمجھا جا سکتا ہے جو مذکورہ اساسات سے مستنبط ہوئی ہو یا کم از کم ان کے اشارات سے سمجھی جاتی ہو۔ ان کے علاوہ کوئی ایسی چیز دین میں لا داخل کرنا جو نہ دین کے کسی اصول ہی سے نکلتی ہو اور نہ اس کے مجموعی نظام ہی سے کوئی جوڑ رکھتی ہو، صریحاً بدعت ہے۔ بالخصوص جس چیز کے بارہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت موجود ہو اس میں محض اپنے ذوق اور اپنی ایجاد سے کوئی اضافہ کرنا یا اس سنت کا بدل پیدا کرنا بدعت کی نہایت ہی مکروہ قسم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی تمام دینی ایجادات کے بارہ میں یہ جامع حکم دیا ہے:۔

من احدث فی امرنا هذا ما لیس

جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز لا داخل کی جو

منه فهو رد۔ (متفق علیہ) اس سے جوڑ نہیں رکھتی تو ایسی شے مردود ہے۔

بعض احادیث میں آپؐ نے بدعت کی تردید فرماتے ہوئے علمِ دین کے بنیادی ماخذوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان سے ہٹ کر کوئی چیز دین میں پیدا کرنے کی کوشش کرنا بدعت ہے۔ اگر کوئی چیز ان کے اشارات سے نکل رہی ہو یا ان کے حدود کے اندر داخل ہو یا وہ زندگی کے اس دائرہ سے تعلق رکھنے والی ہو جس کو اسلام نے ہماری اپنی صواب دید پر چھوڑا ہے تو وہ چیز بدعت نہیں کہلائے گی۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب الله وخیر الهدی هدی محمد وشر الامور محدثاتها وکل بدعة ضلالة۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

آپ نے ارشاد فرمایا بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمدؐ کا طریقہ ہے اور بدترین چیزیں وہ ہیں جو ان کے اندر ان سے بے جوڑ نئی پیدا کی جائیں اور ہر ایسی بدعت گمراہی ہے۔

اس بدعت کی سب سے زیادہ بُری قسم یہ ہے کہ کسی جاہلی فکر و فلسفہ، کسی غیر اسلامی طور طریقہ، اور کسی کافرانہ رنگ ڈھنگ کو اسلام کے عقائد و ایمانیات یا اس کے نظامِ معیشت و معاشرت یا نظامِ تہذیب و تمدن میں گھسانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

ابغض الناس الی الله ثلاثة:۔ ملحد فی الحرم ومبتغ فی الاسلام سنة الجاهلیة ومطلب دم امرء مسلم لیهریق دمه (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین شخص سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہیں۔ ایک وہ جو حرم کے اندر کسی بے دینی کا ارتکاب کرے دوسرا وہ جو اسلام کے اندر جاہلیت کے کسی طریقہ کو گھسانے کی کوشش کرے، تیسرا وہ جو کسی مسلمان کی جان کے درپے ہو تاکہ اس کا خون بہائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے کہ ہر بدعت جو ایجاد کی جاتی ہے وہ کسی نہ کسی سنت کو ضرور ڈھاتی ہے اور جب کوئی قوم سنت کی جگہ بدعت کو پسند کرنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو سنت کی نعمت سے محروم کر دیتا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے

ما احدث قوم بدعة الا رفع جس قوم نے بھی کوئی بدعت ایجاد کی تو اسی کے مانند اس کے

مثلہا من السنۃ۔ (مشکوٰۃ بحوالہ احمد) اندر سے سنت اٹھالی گئی۔

تحریف بدعت کے بالمقابل علمِ حقیقی کو تاراج کرنے والی دوسری چیز تحریف ہے۔ بدعت میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی نہیں ہے اس کو دین میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ اور تحریف میں غالب پہلو یہ ہے کہ جو چیز دین کی ہے، اپنے اغراض و خواہشات کے خلاف ہونے کے سبب سے اس کو دین سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ علمِ حقیقی پر یہ آفت متعدد شکلوں میں نازل ہوئی ہے۔

اس کی ایک عام اور معروف شکل تو یہ رہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام کی ایسی من مانی تاویلیں کی جائیں جو اس کلام سے دُور کا بھی کوئی واسطہ نہ رکھتی ہوں۔ الفاظ، قواعدِ زبان، سیاق و سباق، نظائر و شواہد اور خود متکلم کے دوسرے اقوال و ارشادات چیخ چیخ کر اس تاویل سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہوں لیکن محض اپنی خواہشاتِ نفس کی اتباع میں اس تاویل کو کلامِ الٰہی پر یا کلامِ رسول پر چپکنے کی کوشش کی جائے۔

اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ تاویل و تفسیر کے تکلف میں پڑنے کے بجائے سرے سے اس چیز ہی کو بدل ڈالا جائے جو امرِ حق کی طرف رہنمائی کے لیے نشانِ راہ کا کام دے رہی ہے نفی کو اثبات، شک کو یقین، زید کو بکر اور دن کو رات بنا کر اصل حقیقت کی اس طرح قلبِ ماہیت کر دی جائے کہ اس کو پہچاننا محال یا تقریباً محال ہو جائے۔

اس کی تیسری شکل یہ ہے کہ لفظ یا فقرے کو قرأت اور طرزِ ادا کے تصرفات سے اس طرح بدل دیا جائے کہ وہ جس حقیقت کی طرف رہنمائی کے لیے وضع ہوا تھا اس سے ہٹ کر ایک بالکل ہی مختلف سمت میں مڑ جائے۔

تحریف کی مذکورۂ بالا تینوں شکلوں کی طرف قرآن مجید نے یہود کے حالات بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَىٰ خَائِنَةٍ مِّنْهُمْ۔	الفاظ کو ان کی جگہوں سے ہٹاتے ہیں اور انہوں نے اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر دیا جس کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اور تم برابر ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے۔

دوسری جگہ ہے :-

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ

اور یہودیوں میں سے وہ بھی ہیں جو کلمات کو ان کی جگہوں سے ہٹاتے ہیں اور کہتے ہیں "سمعنا وعصینا" اور "اسمع غیر مسمع" اور "راعنا" اپنی زبانیں موڑ کر اور دین کی توہین کے لیے۔

یہود و نصاریٰ کے اندر تحریف کی یہ تینوں قسمیں پائی جاتی تھیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو علم حقیقی کی روشنی سے بالکل ہی محروم کر دیا۔ مسلمانوں کے اندر جو گمراہ فرقے اُٹھے وہ تحریف کی پہلی اور دوسری قسم پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب و سنت کی لفظی تحریف میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر خاص فضل ہے۔

کتمانِ حق اسی سلسلہ کی ایک اہم چیز کتمانِ حق بھی ہے۔ کتمانِ حق کا مفہوم یہ ہے کہ ایک امر کو جانتے ہوئے اور اس کے اظہار کی ضرورت موجود ہوتے ہوئے کسی طمع یا خوف کے سبب سے اس کے اظہار سے گریز کیا جائے۔

حق کی شہادت دینا اس امت کا حقیقی فرضِ منصبی ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین اور اس کے آتائے ہوئے علم کو صحابہؓ کو پہنچایا اسی طرح اس امت کے لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائیں۔

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی ایک امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے سامنے حق کی گواہی دو اور رسول تمہارے سامنے گواہی دے۔

اسی فریضہ کی ادائیگی کا مطالبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے ان الفاظ میں فرمایا ہے :-

بلّغوا عنی ولو اٰیۃ

تم میری طرف سے لوگوں کو علم حق پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی سہی۔

اسی حقیقت کی طرف حضورؐ نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے :-

نضر اللہ عبدا سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا واداھا۔ — اللہ تعالیٰ اس بندے کے چہرے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اس کو یاد کیا اور محفوظ رکھا اور لوگوں کو پہنچایا۔

اور جو لوگ علم رکھتے ہوئے اس کو چھپاتے ہیں ان کو حضور نے یہ وعید سنائی ہے۔

من سئل عن علم علمہ ثم کتمہ الجم یوم القیٰمۃ بلجام من نار۔ — جس سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کو وہ جانتا ہے لیکن اس نے چھپائی تو اس کو قیامت کے دن آگ کی لگام لگائی جائے گی۔

اس فرض سے عموماً دو چیزیں مانع ہوتی ہیں۔ ایک طمع، دوسری خوف۔

آدمی ان لوگوں کے سامنے اظہار حق سے لازماً جھجکتا ہے جن سے اس نے کوئی طمع وابستہ کر رکھی ہو۔ ایسوں کے سامنے دین کی وہ باتیں تو کہی جاتی ہیں جو ان کو پسند ہوں، یا کم از کم انکو ان سے اختلاف نہ ہو۔ لیکن وہ باتیں کہنا جو ان کی خواہشوں کے خلاف ہوں اور جن سے ان کی بداعمالیاں بے نقاب ہوتی ہوں، کم از کم اس شخص کے لیے ناممکن ہے جو ان سے اپنی کوئی دنیوی غرض رکھتا ہو۔ حضرت کعب احبار نے حضرت عمرؓ کے ایک سوال کے جواب میں اسی حقیقت کو یوں آشکارا کیا ہے۔

ان عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال لکعب من ارباب العلم قال الذین یعملون بما یعلمون قال فما اخرج العلم من قلوب العلماء قال الطمع — حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب سے پوچھا کہ اہل علم کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ علم کو علماء کے سینوں سے نکالا کس چیز نے؟ انہوں نے جواب دیا لالچ نے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ دارمی)

یہی صاحب طمع اور خوشامدی گروہ ہے جس نے اپنے اغراض کے لیے ارباب اقتدار کی ہر بے راہ روی اور گمراہی کو دین ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس طرح وہ خود بھی ذلیل ہوا اور اس نے دین کو بھی ذلیل کیا۔ انہی لوگوں کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے۔

قال لو ان اھل العلم صانوا العلم — فرمایا کہ اگر اہل علم اپنے علم کی قدر کرتے اور اس کو اس کے

وو ضعوہ عند اھلہ لسادوا بہ اھل زمانھم ولکنھم بذلوہ لاھل الدنیا لینالوا بہ من اھل الدنیا فھانوا علیھم۔

حقداروں کے سامنے پیش کرتے تو اس کے ذریعہ سے وہ اپنے زمانہ کے لوگوں پر سرداری کرتے لیکن انہوں نے دنیا داروں سے صلہ حاصل کرنے کے لیے اس علم کو ان کی مقصد براری کے لیے استعمال کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نگاہوں میں ذلیل ہو کے رہ گئے۔

اسی قسم کے اقتدار پرست اور دین فروش گروہ کا ذکر حضور نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اناسًا من امتی سیتفقھون فی الدین ویقرؤن القرآن یقولون ناتی الامراء فنصیب من دنیاھم ونعتزلھم بدیننا ولا یکون ذالک کما لا یجتنی من القتاد الا الشوک کذالک لا یجتنی من قربھم (مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو فقہ اور تفسیر کا علم حاصل کریں گے۔ پھر وہ کہیں گے کہ اس میں کیا برائی ہے کہ ہم ارباب اقتدار سے مل کے ان کی دنیا سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے دین کو ان سے بچائے رکھیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔ جس طرح ببول کے درخت سے کانٹے کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہو سکتا اسی طرح ارباب اقتدار کے قرب سے (راوی کا خیال ہے) گناہ کے سوا اور کچھ نہیں حاصل ہو سکتا۔

اسی قسم کے خوشامدی اور ارباب اقتدار کی عبادت کرنے والے دین فروشوں کے متعلق حضور نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ اللہ کو سب سے زیادہ مبغوض ہیں اور جب اس قسم کے لوگ پیدا ہونے لگیں گے تو دین کی ساری حقیقت مٹ جائے گی۔ صرف کچھ رسوم اور الفاظ باقی رہ جائیں گے۔ حضور کا ارشاد ہے:۔

ان من ابغض القراء الی اللہ تعالیٰ الذین یزورون الامراء یوشک ان یاتی علی الناس زمان لا یبقی من الاسلام الا اسمہ ولا یبقی من القرآن الا رسمہ الحدیث (مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی)

خدا کے نزدیک سب سے زیادہ برے وہ مدعیان علم قرآن ہیں جو ارباب اقتدار کے تقرب کے طلبگار ہیں۔ قریب ہے کہ وہ زمانہ آئے کہ اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہ جائے اور قرآن میں سے صرف اس کے الفاظ۔

دوسری چیز جو اظہارِ کلمۂ حق سے مانع ہوتی ہے وہ خوف ہے۔ یہ خوف مختلف چیزوں کا ہوتا ہے کبھی اس عزت وسیادت کے چھن جانے کا ہوتا ہے جو آدمی کو حاصل ہوتی ہے، کبھی عوام کی برہمی اور خفگی کا اندیشہ ہوتا ہے کبھی اربابِ اقتدار کے غصہ وغضب اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر کسی آزمائش کے پیش آجانے کا خوف ہوتا ہے۔ اس خوف کو قرآن نے متعدد مقامات میں بڑی وضاحت کے ساتھ منافقین کی صفات میں سے گنایا ہے اور اچھے مسلمانوں کی تعریف اس کے مقابل میں یہ بیان کی ہے۔

فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ۔ (۵۴۔مائدہ)

پس عنقریب اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور جو اس سے محبت کریں گے، جو مسلمانوں کے لیے نرم اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے، جو اللہ کے راستہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

اسی حقیقت کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

لا یمنعن احدا منکم هیبة الناس ان یقول بحق اذا علمه۔

تم میں سے کسی کے لیے انسانوں کا رعب اس بات سے مانع نہ ہو کہ وہ حق کا اظہار نہ کرے جبکہ وہ اس کو جانتا ہے۔

اسی چیز کو اس مشہور حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔

افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر۔

سب سے زیادہ مبارک جہاد کسی حق سے منحرف صاحب اقتدار کے سامنے کلمۂ حق کا کہنا ہے۔

اگر قوم کے اندر اظہارِ حق کا یہ جوہر باقی نہ رہے اور مداہنت اور کتمانِ حق کی بیماری پھیل جائے تو پھر اس کی سزا اس قوم کو یہ ملتی ہے کہ اس کے اندر سے علمِ حق غائب ہو جاتا ہے۔ پچھلی امتوں میں سے یہود و نصاریٰ اس کی نہایت عبرت انگیز مثال موجود ہیں۔

اشتغال بالادنیٰ | علمِ حقیقی کی نعمت سے محروم کرنے والی چیزوں میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ دوسرے حقیر علوم کو اس علم پر ترجیح دی جائے اور آہستہ آہستہ یہ بدمذاقی اس قدر بڑھ جائے کہ پھر طبیعت کے اندر اعلیٰ اور

حقیقی علم کے لیے سرے سے کوئی رغبت ہی باقی نہ رہ جائے عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جن چیزوں کے پڑھنے پڑھانے سے دنیوی منفعتیں اور عزتیں حاصل ہو سکتی ہیں، یا جن چیزوں کا علم وقت کی سوسائٹی میں شہرت اور حصولِ مقاصد کا ذریعہ بن سکتا ہے، یا جن چیزوں کا مطالعہ لذت اور بے فکری کے ساتھ اوقات گذاری کا سامان فراہم کرسکتا ہے، طبیعتیں انہی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور یہ میلان اس قدر غالب اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جو یا تو نرے قدامت پرست ہوں یا زمانہ کے رجحان عام بلکہ اس کی وبائے عام سے لڑ کر جینے کا دم داعیہ رکھتے ہوں اور کوئی بھی اس بات کی ہمت نہیں کرسکتا کہ اپنا اور اپنی اولاد کا وقت ان چیزوں کے سیکھنے سکھانے پر "ضائع" کرے جو حقیقت کے نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی قدر و قیمت کی حامل ہوں لیکن وقت کے بازار میں ان کی کوئی مانگ نہ ہو۔

پچھلی ملتوں میں سے یہود کے متعلق صاف قرآن میں بیان ہوا ہے کہ جب ان کے اندر کلدانیوں کے علوم — سحر و ساحری — اور صوفیانہ قسم کے علوم مثلاً علم خواص کلمات اور عملیات حب و بغض اور تسخیر جنات و شیاطین کا زور ہوا تو وہ ان میں اس قدر منہمک ہو گئے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب پیٹھ پیچھے پھینک دی اس کے سیکھنے سکھانے کے لیے ان کے اندر سرے سے کوئی میلان باقی ہی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ قرآن نے ان کا حال یہ بیان کیا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ۔ (۱۰۲ البقرہ)	اور جب ان کے پاس ایک رسول آیا اللہ کی طرف سے سچ ثابت کرنے والا ان پیشینگوئیوں کو جو ان کے پاس موجود تھیں تو ان لوگوں کے اندر سے جن کو کتاب ملی تھی ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا، گویا وہ اس سے واقف ہی نہیں۔ اور پیچھے پڑ گئے ان چیزوں کے جو شیاطین سلیمان کے زمانہ میں پڑھتے پڑھاتے تھے۔

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا۔

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ	پس ان سے سیکھتے تھے وہ علم جس

بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۔

کے ذریعہ سے مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کرا سکیں۔ حالانکہ اس ذریعہ سے وہ خدا کے حکم کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اور وہ سیکھتے تھے وہ علم جو ان کو نقصان پہنچاتا تھا نفع نہ پہنچاتا تھا۔

یہی صورت مسلمانوں کے اندر اس وقت پیش آئی جب یونانی علوم کا فتنہ پھیلا۔ عباسیوں کے زمانہ میں جب منطق و فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور مسلمانوں نے ان کا پڑھنا پڑھانا شروع کیا تو تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حال ہو گیا کہ بہتر سے بہتر دینی حلقوں میں بھی قرآن اور حدیث کا علم محض برائے تبرک رہ گیا۔ یہ چیزیں وقت کی سوسائٹی کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گئیں کہ وہ شخص پڑھا لکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جو ان چیزوں کے اندر کچھ دخل نہ رکھتا ہو۔ اول تو لوگوں میں دین کو پیش کرنے کا ولولہ ہی سرد پڑ گیا۔ لیکن اگر کچھ باقی رہا بھی تو اس کی جرأت بہت کم لوگ کر سکتے تھے کہ دین کو براہِ راست کتاب و سنت کے واسطہ سے پیش کریں بلکہ وہ مجبور ہوئے کہ انہی بولیوں اور انہی اصطلاحات میں بات کریں جو منطق و فلسفہ کے رعب و اثر سے زبانوں پر چڑھ ہادی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے پیش کرنے کا اصلی ذریعہ علمِ کلام بن گیا جس کو مذہب کی بگڑی ہوئی شکل کہنا تو اس کی عزت افزائی ہو گی۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلسفہ اور منطق اور یونانی علمِ مناظرہ کی ایک مسخ شدہ شکل تھا۔

اسی طرح اربابِ تصوف نے اشراقیت اور ویدانت سے جو اثر قبول کیا تو اس راہ سے بہت سے فتنے ایسے گھس آئے جو علمِ حقیقی کی رہنمائی سے محروم کرنے والے ثابت ہوئے۔ اور بعد کے زمانوں میں تو ان لوگوں کا بیشتر اعتماد صرف گنڈوں، تعویذوں اور تسخیر و تاثیر کے عملیات پر رہ گیا۔ جس نے ان چیزوں میں کچھ دخل حاصل کر لیا اس کا کاروبار چل گیا اور جو اس میں پیچھے رہے وہ بالکل ہی ناکام ثابت ہوئے۔ بہت ہی تھوڑے لوگ ایسے نکلے جو اس روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کی جرأت کر سکے۔

اب اس دورِ آخر میں اس فتنہ کا جو حال ہے اس کا اندازہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ کر سکتا ہے کہ

ربانی ص [illegible]

پس چہ باید کرد اے اقوامِ غرب

عبد الحمید

[یہ مضمون دراصل مصنف نے انگریزی میں لکھا ہے، بعد میں خود ہی انہوں نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے، جو "ترجمان" میں دیا جارہا ہے۔]

پچھلے دنوں روزنامہ ڈان میں انگلستان کے ایک ممتاز اور مقتدر مزدور رہنما مسٹر بیون (BEVEN) کا ایک بیان شائع ہوا۔ اس میں صاحب موصوف نے اسلامی ممالک میں روحانی بیچینی اور اسلامی تحریکات کے متعلق بعض ایسے خیالات کا اظہار فرمایا ہے جو نہایت اہم ہیں۔ اُن کا ارشاد ہے :-

"یہ عناصر یعنی مصر اور عرب ممالک میں الاخوان المسلمون، ایران میں فدایانِ اسلام اور پاکستان میں جماعت اسلامی ایک ہرنے والی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ مسلم ممالک میں ان لوگوں کی سرگرمیاں اُن "مسیحی دیوانوں" (CHRISTIAN ZEALOTS) سے ملتی جلتی ہیں جو یورپ میں سالہا سال تک حرّیت اور ترقی کے خلاف صف آرا رہے۔ مگر مجھے پورا یقین ہے کہ جس طرح یورپ میں یہ مذہبی دیوانے رہوار زمانہ کو روکنے سے قاصر رہے۔ اسی طرح اسلام کے یہ اندھے مقلدین بھی اپنی اقوام کی راہ میں زیادہ دیر تک حائل نہیں ہوسکیں گے۔ حقیقی اسلام حقیقی عیسائیت کی طرح ترقی کا مخالف نہیں مگر ان مذاہب کے جاہل اور تنگ نظر مبلغین اپنے اپنے ممالک میں ایسے پریشان کن حالات پیدا کر رہے ہیں جن میں کمیونزم اور الحاد کو آسانی سے پنپنے کا موقع بہم پہنچے گا۔"

میرے لیے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ بیون صاحب ایسے صاحبِ فکر نے مشرق کے، بلکہ پوری دنیائے اسلام کے جس نازک مسئلہ سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے احساسات اور تاثرات سے مجھے دلی رنج بھی ہوا۔ یہ رنج اس وجہ

سے نہیں کہ انہوں نے اسلامی تحریکات کے خلاف کچھ کہا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان جیسے بالغ النظر مدبر سے ہمیں حالات کے زیادہ گہرے مطالعہ کی توقع تھی۔ چند سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرکے رائے قائم کرلینا ہمیں کم ازکم اُن کے شایانِ شان نہیں سمجھتا۔ ہمارے اور اُن کے درمیان ملاقات کی ساری راہیں مسدود ہی سہی مگر مراسلت کی راہ تو مسدود نہ تھی۔ وہ بڑی آسانی سے ایک نوازش نامہ کے ذریعہ ہم سے ہمارا مقصد اور لائحہ عمل دریافت کرسکتے تھے۔ ہم وہ مصلحت سمجھنے سے ابھی تک قاصر ہیں جس کے تحت انہوں نے واقفیت سے زیادہ رائے زنی کو ضروری سمجھا اور بغیر کسی غور وفکر کے ایک بیان داغ دیا۔ اصحابِ فکر کا شیوہ شروع سے ہی یہ چلا آیا ہے کہ وہ تاریخ کی ہر اضطراری چال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوموں کے دلوں میں اُتر کر، اُن کے گہرے جذبات اور نازک احساسات کا کھوج لگانے میں پوری پوری زندگیاں کھپا دیتے ہیں اور اس کے بعد کسی فیصلہ پر پہنچتے ہیں۔ پھر یہ فیصلہ بھی کوئی حتمی اور بے لچک نہیں ہوتا بلکہ حالات کی معمولی کروٹ اُس میں ہر آن تغیر و تبدل پیدا کرتی رہتی ہے۔ انگریز ایسی حقیقت پسند قوم نے دنیا کے ہر معاملہ میں یہی رویہ اختیار کیا۔ مگر ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے معاملہ میں اس قوم نے اس معقول راہ کو چھوڑ کر بالکل ایک دوسرا طریقہ پسند کیا۔ اُس نے کبھی یہ ضرورت نہ سمجھی کہ وہ اس قوم کے احساسات کو جاننے کی کوشش کرے، وہ اسباب جو اس کو مضطرب اور بےچین کررہے ہیں اُن کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کرے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچے۔ مسلمانوں کے بارے میں اُس کا وطیرہ ایک ہی رہا ہے۔ جب کبھی ملّت اسلامیہ نے اسلام کا نام لیا تو اس کا چہرہ غضب آلودہ ہوگیا۔ آنکھوں میں خون اُتر آیا اور پُوری قوت سے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس جب دنیا کے کسی حصہ میں یہ خبر سنائی دی کہ مسلم قوم نے اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پسِ پُشت ڈال دیا ہے تو اس کی باچھیں کھل گئیں اور چہرے پر رونق آگئی، لیکر ان لوگوں کو سینے سے لگایا اور یوں معلوم ہوتا کہ وہ عرصہ سے اسی خوشخبری کی منتظر تھی۔ اسلام ہی وہ اصل دیوار تھی جس نے انگریزی قوم کو اس سے دُور رکھا تھا ورنہ قوم کی حیثیت سے اسے اس سے کوئی پرخاش نہ تھی۔

اس ضمن میں یہ بات بھی کچھ کم معنی خیز نہیں کہ میون صاحب نے اسلامی تحریکات کے خلاف

اس نازک وقت میں لب کشائی کی ہے جب پوری دنیائے اسلام استعماری طاقتوں سے اپنے غصب شدہ حقوق لوٹانے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ جو جذبہ اس کے خون کو گرم اور ارادوں کو جوان کر رہا ہے وہ اسلام ہے۔ اس کی حیثیت شعوری یا غیر شعوری رجحان کی کیوں نہ ہو لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مسلم اقوام میں یہ چھپا ہوا احساس ــــ کہ جو کچھ انہیں ہونا چاہیے وہ اب نہیں رہے، اسلام کے اصولوں پر ان کا معاشرہ استوار نہیں اور ان کا نظامِ زندگی وہ نہیں جس کا نقشہ قرآن نے پیش کیا تھا ــــ انہیں سرگرم عمل کر رہا ہے۔ مسلمانوں کے اس جذبہ کو جو اُن کی زندگی کا واحد محرک ہے جس بے دردی سے پائمال کیا جا رہا ہے وہ نہایت ہی افسوسناک ہے۔ مغرب کی استعماری طاقتیں کہیں یہ "فریضہ" خود اپنے "دست مبارک" سے سرانجام دے رہی ہیں اور کہیں "استعماریت نواز ملکی اقلیت" کی وساطت سے اس "مقدس مشن" کی تکمیل کی جا رہی ہے۔ مسٹر بیون کی قوم بھی چونکہ اس "فرض" میں دوسری اقوام کی شریک ہے اس لیے اگر کوئی فرد بھی صاحب موصوف کے ان خیالات کو ایک ایسے "شکاری" کی بوکھلاہٹ سمجھے جس کے بوسیدہ جال سے پرندے پھڑ پھڑا کر اُڑتے جا رہے ہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر میں انہیں ایسا تصور نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی رائے سیاسی اور ملکی تعصبات سے منزہ ہے اور وہ خلوص پر مبنی ہے۔ مگر جس طریق سے انہوں نے اپنے احساسات کا اظہار فرمایا ہے، وہ ایک ایسی ذہنیت کا پتہ دیتا ہے جس کو بیون صاحب کی طرف منسوب کرنا میرے لیے نہ صرف دشوار بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ بیون صاحب کے خیالات کا پبلک میں آجانا ضروری تھا۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے مخالفین ان سے ہمارے خلاف اپنی ہنگامہ آرائیوں اور ستمرانیوں میں مدد لیں گے، مگر انشاء اللہ اس شر سے بھی ہم خیر ہی اخذ کریں گے اور ہماری کوشش ہوگی کہ انہیں بیگانوں اور یگانوں کی بہت سی دیرینہ غلط فہمیوں کے ازالہ کا واسطہ بنائیں۔ اس لیے بیون صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس ضمن میں یہ گذارش کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب بیون صاحب نے جو باتیں عیسائیت اور عیسائیوں کے متعلق ارشاد فرمائی ہیں اُن کی نسبت ہم کچھ عرض کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ اس کے بارے میں خود مسیحی علماء ہی بہتر طریق پر کوئی فیصلہ دے سکتے ہیں۔ بیون صاحب ان کے گھر کے آدمی ہیں اور وہ اُن کے حالات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ البتہ بیان کے اس حصہ سے تعرض کرنا ہمارے لیے ناگزیر ہے جس میں انہوں نے اسلام اور اسلامی تحریکات خصوصاً

جماعت اسلامی پاکستان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں صاحب موصوف کو اس امر کا یقین دلاتا ہوں کہ جس جذبہ ہمدردی سے مجبور ہو کر انہوں نے "مذہبی دیوانوں" سے ملتِ اسلامیہ کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا ہے اُسی جذبہ ہمدردی نے مجھے بھی اس بات پر مجبور کیا ہے کہ جناب بیون صاحب اور اُن کی وساطت سے انگریزی قوم اور مغربی دنیا کے سوچنے اور سمجھنے والے اشخاص کی خدمت میں یہ گزارشات پیش کروں:-

تاریخ انسانی کا غالباً سب سے زیادہ المناک باب وہ ہے جو فرنگی استعماریت اور اسلام سے متعلق ہے جب تک مسلمان اسلام سے دُور رہے، انگریز اُن سے قریب رہا، مگر جونہی کوئی فرد یا گروہ احیائے اسلام کی کوشش میں مصروف ہوا تو یہ قوم یک لخت اُس کی مخالفت پر اُتر آئی۔ امت کے بڑے بڑے صلحاء اور ائمہ کو جن کی پاکبازی، نیکی، سلامت روی اور اصابت رائے پر خدا کی ساری مخلوق گواہ تھی، سخت سے سخت اذیتیں پہنچائی گئیں۔ کبھی اُن پر غداری اور قوم دشمنی جیسے گھناؤنے الزامات لگا کر اپنوں اور بیگانوں میں رسوا کیا گیا۔ کبھی انہیں سالہا سال تک ملک بدر رکھا گیا اور کبھی قید و بند کی صعوبتوں سے اُن کے ارادوں کو متزلزل کرنے کی سعی ناکام کی گئی اور ان میں سے بعض کی جانیں لے کر بھی اس قوم کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ پھر معاملہ یہاں تک ہی محدود نہ رہا بلکہ قوم کے سارے طبقوں میں سے چن چن کر منافقوں کو اکٹھا کیا گیا تاکہ وہ اسلام اور اس کے علمبرداروں کے خلاف لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلائیں۔ روپے دے دے کر کمزور سیرت کے انسانوں کو خریدا گیا تاکہ وہ دینِ حق میں طرح طرح کے رخنے ڈالیں۔ ہر اُس شخص کی پیٹھ ٹھونکی گئی جس نے مسلمانوں کے اندر فروعی اختلافات کو ابھارا اور انہیں اپنے اصل مقصد سے دُور لے جانے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس قوم میں جس قدر منافق، تھڑدلے، بے ضمیر انسان تھے اُن سب کو حکمران قوم کی پشت پناہی حاصل رہی۔ انہیں سنگینوں اور بندوقوں کے پہرے میں اقتدار کے تخت پر متمکن کیا گیا اور پھر ان کے ذریعہ ہر اسلامی تحریک کو کچلنے کا کام لیا گیا۔ سید جمال الدین افغانیؒ، مفتی محمد عبدہٗ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حسن البنّاؒ اور اسی طرح کے دوسرے صلحاءِ امت انہی کے تشدد کا شکار ہوئے۔ تاریخ کی اس بدیہی شہادت کے پیش نظر مسلم قوم کے دل و دماغ میں یہ خیال اچھی طرح راسخ ہو گیا کہ انگریز اسلام کا سخت دشمن ہے۔

آج سے چند سال پیشتر جب انگریز سارے مشرق پر براہِ راست حکمران تھا تو اس کا یہ رویہ کچھ سمجھ میں

آسکتا تھا ہمیں یہ معلوم تھا کہ سب ریشہ دوانیاں صرف اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کی جارہی ہیں مگر اب جبکہ انگریز اپنے اُس بلند مقام سے گر کر بالکل نچلی سطح پر آ گیا ہے، اب جبکہ اُس کی وہ قوت اور شوکت باقی نہیں رہی اور وہ اس بات پر مجبور ہو گیا ہے کہ اپنی "شکار گاہوں" کو خیر باد کہہ کر اپنے ملک کی چار دیواری میں پناہ گزیں ہو تو ایک حقیقت پسند قوم کی حیثیت سے اُس کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے فکر و نظر کے زاویوں میں بھی تبدیلی پیدا کرتا، اپنے سوچنے اور سمجھنے کے انداز بدلتا اور اپنے تعلقات کے استوار کرنے میں نئے معیار قائم کرتا، مگر اسے دنیا کی بدبختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے مسلمانوں کے ساتھ اپنے طرزِ عمل میں کوئی تغیر کرنا پسند نہیں کیا۔ ہم اس سلسلہ میں اس قوم کے قائدین سے بڑے ادب سے گذارش کرتے ہیں کہ انہیں اب اپنی پرانی روش کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔ دنیا کے حالات اب آپ کے لیے اس طرح موافق نہیں ہے جس طرح کہ چند سال پہلے تھے اور اگر آپ نے اس سلسلہ میں اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کی تو یہ پالیسی آپ کے حق میں کسی طرح بھی فائدہ مند نہ ہو گی۔ آپ کی حیثیت اب امتِ مسلمہ کے ساتھ حاکم اور محکوم کی نہیں بلکہ ایک برابر قوم کی ہے۔ اس لیے آپ کا فرض ہے کہ آپ اس قوم کے نازک احساسات کو جاننے کی کوشش کریں۔ اگر آپ گنتی کے چند خوشامدی مصاحبین کے بھروں میں آکر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ اسلام اور احیائے اسلام کی کوششوں کے خلاف معاندانہ روش اختیار کر کے بھی اس قوم کے دل موہ لیں گے تو یہ سخت غلطی ہے۔ ہم آپ کو بروقت اس غلطی پر متنبہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ دوستی کے پردے میں آپ سے دشمنی کر رہے ہیں۔ اسلام اس قوم کی زندگی میں ایک عنصر کی حیثیت سے شامل نہیں بلکہ وہی اس قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مبدأ اور اساس ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہی اس قوم کا جوہر حیات ہے۔ اس جوہر کی حفاظت اور پاسبانی امت کے بڑے بڑے متمدن انسانوں نے کی اور اس کو مٹانے میں نہ تو اپنوں کی ملوکیت اور جباری کچھ کام آئی اور نہ غیر ملکی طاقتوں کی ساحری و ساحری نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ مسلم قوم کے معاملہ میں اس جوہر اور قوت کو نظر انداز کرنا گمراہی ہے۔ جو لوگ اس تاریخی قوت کو ملاؤں کی تحریک سمجھ کر اسے مذاق میں اڑانے کی غلطی کریں گے انہیں بہت جلد ہی اپنے جائزے کی کوتاہی کا اندازہ ہو جائے گا۔ پس ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ حالات کا مطالعہ کرنے میں گہری سوچ بچار

سے کام لیں اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے آپ کو غلط اندیش لوگوں کے حوالے نہ کریں ورنہ اگر ایسا ہوا کہ ملک کی عوامی طاقت کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر، اس کی امنگوں کے خلاف آپ نے چند اقتدار یافتہ افراد کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تو آپ کو ابھی سے سمجھ سوچ لینا چاہیے کہ اس قوم کے دل میں آپ کے لیے کوئی عزت باقی نہ رہے گی اور آپ ہمیشہ کے لیے اس کی ہمدردی سے محروم ہو جائیں گے۔

کمیونزم کے خطرہ نے بلاشبہ ہم دونوں کو اس بات کے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کن کن ذرائع سے کام لے کر ہم اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے بعض معاملات میں ہمارا اشتراکِ عمل بھی ہو جائے مگر یہ حقیقت ہم بغیر کسی لاگ لپیٹ کے آپ کے سامنے رکھتے ہیں کہ جس طریق سے آپ اس خطرہ کو ٹالنا چاہتے ہیں وہ بالکل ناکارہ ہے۔ ڈر فی الحقیقت کوئی تعمیری طاقت نہیں اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ذہنی اور ہنگامی چیز ہے۔ اس پر کوئی معقول قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انحصار نہیں کر سکتی۔ کمیونزم جس کے ڈر سے آپ پر لرزہ طاری ہے. نوعِ انسانی کے سامنے ایک مثبت پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس کے اصولوں اور نعروں میں گونا گوں کشش موجود ہے۔ اس کی آئیڈیالوجی لوگوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ کیا اتنی بڑی قوت کا محض ڈر ایسی سلبی چیز سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس غرض کے لیے تو ہمیں کوئی ایجابی چیز چاہیے جو دائمی اور مستقل ہو۔ جس کی قوتِ جاذبہ سے ہم جڑ جائیں۔ جس کی قوتِ محرکہ سے ہم متحرک ہو جائیں، جو ہماری تمام تعمیری قوتوں اور صلاحیتوں کو اُبھار دے، اور جس کے فیض سے ہمیں وہ اطمینان اور سکون حاصل ہو جو کمیونزم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ خود فیصلہ کیجیے کہ کیا سرمایہ دارانہ نظام وقت کے ان تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ وہ نظام جس نے پچھلی ایک صدی میں پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہو۔ اُس پر تکیہ کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ مشرق کی کمزور اقوام جانتی ہیں کہ یہ صرف اسی نظام کی برکتیں تھیں کہ اُن کی آزادیاں سلب کی گئیں، اُن کے ممالک کو تباہ و برباد کیا گیا اور اُن پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان حالات میں کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مسلم اقوام استعماریت کے نام پر آپ کا ساتھ دیں گی؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ قومیں بھی مستبد اور جابر بن کر آپ کی پیروی میں کمزوروں پر ٹوٹ پڑیں۔ اگر آپ کے یہ عزائم نہیں، اور مجھے یقین ہے کہ پچھلے چند سالوں کی چوٹیں کھانے کے بعد ان میں تبدیلی پیدا ہو چکی ہے تو

پھر نہایت ہی ادب سے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو موقع دیجیے کہ وہ دنیا کے سامنے اُس مثبت پروگرام کو پیش کریں جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ آپ کی اس کے بارے میں جو رائے بھی ہو، ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ کمیونزم کے مقابلہ میں اگر کوئی بہتر آئیڈیالوجی پیش کی جاسکتی ہے تو صرف یہی ہے۔ ہم یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے گی اُس کی زندگی ہر قسم کی کشاکش سے پاک ہوگی۔ ہم اس نظام کی طرف آپ کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو یہ قابل قبول نہیں تو براہِ کرم ہمارے راستہ میں حائل نہ ہوں۔ ہم یہ گذارش کسی جذبۂ نفرت و غضب کے بغیر خالص جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ کمیونزم اور اس کے خطرات کتنے ہی شدید سہی، مگر آپ کو اپنے حواس کو تو بجا رکھنا چاہیے۔ آپ وقتی فائدہ اور نقصان کی فکر میں اتنے کھوئے جا رہے ہیں کہ اپنی حرکات کے دور رس اخلاقی نتائج سے یکسر آنکھیں بند کر لی ہیں۔ آپ غالباً بھول چکے ہیں کہ کشمکش حیات میں اخلاقی موت مر جانے کے بعد کوئی فوجی اور معاشی قوت آپ کو عزت کے مقام پر برقرار نہیں رکھ سکتی۔ مصر، ایران، ٹیونس، انڈونیشیا، مراکو اور الجیریا الغرض پوری دنیائے اسلام میں جس سینۂ فگار المیہ کی آپ ڈائریکٹنگ فرما رہے ہیں، وہ آپ کے لیے کسی نیک نامی کا باعث نہیں بن سکتی۔ وقت خواہ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، بہر حال گذر جاتا ہے۔ مگر تاریخ میں اپنی ایک مستقل یادگار بھی چھوڑ جاتا ہے اور اس کے بُرے اثرات نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔ آپ اس وقت مسلم قوم کے معاملہ میں جس ظلم اور زیادتی سے کام لے رہے ہیں وہ تاریخ میں آپ کی ایک ایسی شرمناک میراث ہوگی جس پر آپ کی آئندہ نسلیں صدیوں تک دنیا میں نظر اونچی نہ کرسکیں گی۔ آپ کے اصل کارنامے وہ نہیں ہیں جو آپ نے اپنی مدح میں خود تصنیف کر رکھے ہیں بلکہ وہ ہیں جو تاریخ میں باقی رہ جائیں۔ آپ نے تاریخ میں اُن رُوسیاہ قوموں کی تصویریں دیکھی ہیں جنھوں نے حق اور انصاف کا خون کیا، جنھوں نے خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کو اپنی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ بنایا۔ کیا آپ نے بھی اس بات کا عزم کر لیا ہے کہ اپنی تصویر کے لیے بھی اسی گیلری میں کوئی بلند جگہ محفوظ کرائی جائے۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی آپ کے ذہن نشین ہونی چاہیے کہ دنیا کی کوئی قوم بغیر مضبوط اور قوی لائل

کہ اپنی آئیڈیالوجی ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ بالخصوص وہ آئیڈیالوجی جس نے اُسے ایک الگ قومی وجود عطا کیا ہو۔ مسلمانوں کے معاملہ پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اسلام نے ہی اس قوم کے خیالات، اس کی تمناؤں، اس کے طرزِ بود و باش، اس کی ضروریات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے۔ مسلم قوم کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ محض افراد کا مجموعہ ہے جس کی اپنی کوئی ٹھوس اور پائیدار رائے نہیں اصولاً غلط ہے۔ اسی لیے اس کے نقطۂ نظر کو بدلنے کی وہ تمام تجاویز جو اس مفروضہ پر مبنی ہوں بہت احتیاط کے ساتھ نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں بلاشبہ وہ کثیر التعداد نسلیں شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً اس میں جذب ہوتی رہیں، مگر وہ قوتِ رابطہ و ضابطہ جس نے ان مختلف نسلوں اور قوموں کے اجزائی تخیلات کو اپنی تفنابیت سے جوڑ کر ایک وحدت بنا دیا وہ اسلام ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اُس برادری سے تعلق رکھتے ہیں جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی ہے۔ ہماری قومیت ایک خاص تنزیہی تصور سے وجود میں آئی ہے۔ آپ کے نزدیک اس تصور کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو مگر مسلم قوم کی نظر میں ہی اُس کی حیات ہے۔ آپ خود ہی سوچیے کہ کیا اس قوم کا اس بنیادی تصور سے انحراف اپنی زندگی اور وجود سے انکار کے مترادف نہیں؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر اس تخیل سے اسے ہٹا کر کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط ثبت کرے۔ آپ جیسے مشفق اور ناصح جو چاہیں کہتے رہیں مگر کوئی قوم جسے خداوند تعالیٰ نے تھوڑی بہت بھی عقل دی ہے وہ اسے گوارا نہیں کر سکتی۔ کیا مسلم قوم کے متعلق آپ کی رائے اس قدر ناقص ہے کہ وہ محض آپ کی خوشنودی کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے پر رضامند ہو جائیگی۔

اگر یورپ کے تنگ نظر پادریوں نے رہوارِ زمانہ کو روکنے کی غلطی کی تو یہ اُن کا اپنا قصور تھا کہ انہوں نے فطرتِ انسانی کے خلاف جدوجہد شروع کی، مگر اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی اسی جرم کا ارتکاب کیا ہو گا۔ مسلم قوم کے نزدیک مذہب کا تصور اہلِ مغرب سے بالکل جداگانہ ہے۔ کوئی شخص جو مسیحی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے نہ اس حقیقت سے اچھی طرح شناسا ہے کہ مسیحیت کی بنیاد صرف اُن اخلاقی تعلیمات پر رکھی گئی تھی جو نئے عہد نامہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی

تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک ریاست کا نظام چلایا جاسکے۔ لہٰذا جب کبھی اہلِ یورپ میں مذہبی حکومت کے قیام کا خیال پیدا ہُوا تو انہیں سوائے چند اخلاقی تعلیمات کے اور کوئی رہنمائی نہ مل سکی، اور معاشرتی ضوابط اور ملکی قوانین کے لیے انہیں پاپاؤں کا دست نگر ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ یہ احکامات کسی وحی والہام سے تو ماخوذ نہ تھے بلکہ خود اُن کے گھڑے ہوئے تھے مگر انہوں نے نہایت ہی عیاری سے انہیں احکامِ الٰہی کے طور پر پیش کر دیا۔

اہلِ کلیسا کی گمراہی کی دوسری وجہ مذہب و سیاست کی تفریق کا نظریہ ہے۔ مسیحی علماء نے وقت کے غلط رجحانات سے متاثر ہو کر روح اور مادہ کی ثنویت کے اصول کا پرچار شروع کر دیا۔ اس سے عام انسانوں میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ انسان کی روح اور جسم ایک دوسرے کی عین ضد ہیں۔ اُس کا جسم ایک قفس ہے جس میں طائرِ روح مقید ہے، وہ قفس اس کی ہر قسم کی ترقی اور پرواز میں حارج ہے۔ روح اپنے مرکزِ اصلی اور سرچشمۂ حقیقت سے اس وقت تک اتصال پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ اس قفس سے آزاد نہ ہو، اس لیے یا تو اس قفس کو توڑ دیا جائے یا اس کی تیلیوں کو اتنا کمزور کر دیا جائے کہ طائرِ روح جب چاہے آزادانہ اپنے آشیانہ کی طرف پرواز کر سکے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ غلط تعلیم اُس عارفِ ربانی نے دی مگر اس امر سے انکار نہیں کہ سینٹ پال اور اس کے پرستاروں نے جس قسم کی اخلاقی تعلیمات عیسائیت کے نام پر لوگوں میں مقبول کرنا چاہیں اس نظریہ سے انہیں تقویت حاصل ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ عیسائیوں میں جسم کی تعذیب، مادیت کا ازالۂ محض، خواہشاتِ انسانی کا استیصالِ کلی، جذبات کشی، تجرد و رہبانیت مذہب کے اصول و فرائض میں شامل ہو گئے۔ مذہب کے سچے پرستاروں نے اپنی نجات کے لیے جسم اور اس کے متعلقات سے نہ صرف غفلت برتنا شروع کی بلکہ اس کے خلاف ایک ایسا معاندانہ جذبہ پیدا کر لیا جو کسی راہ رَو کو ایسے پتھر کے مقابلہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے اُس نے بار بار ٹھوکر کھائی ہو۔ اس سے دنیا کو دارالعذاب، زندگی کو ایک بارِ گراں اور دنیاوی تعلقات کو طوق و سلاسل سمجھا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تصورات پر کسی محدود سے محدود رقبۂ زمین میں بھی کوئی تمدنی زندگی معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ حضرت مسیح کے پیرو دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے

اور عیسائی ممالک میں بہ یک وقت معصیت و آزادی اور زہد و رہبانیت کی دو متقابل تحریکیں دوش بدوش چلنے لگیں۔ صحرا نشین راہب معرفت الٰہی میں اس قدر گم تھے کہ امورِ سلطنت تو کیا انہیں اپنے جسموں تک کی ہوش نہ رہی۔ اس کے برعکس شہروں میں بسنے والوں نے خداوند تعالیٰ سے سارے رشتے توڑ کر اپنے آپ کو قیصر کے حوالہ کر دیا۔ وہ دنیا اور اس کے فوائد و لذائذ میں اس قدر کھو گئے کہ انہیں کبھی بھی خدا کی پکار اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔

دین و دنیا کی یہ دو متقابل تحریکیں جس طرح انسان کی خارجی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں بالکل اسی طرح انسان کی داخلی زندگی میں بھی انہیں تسلط حاصل ہوا۔ انسان کے ذہن میں یہ خیال بڑی سرعت کے ساتھ پرورش پانے لگا کہ مذہب زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آسکے۔ اس کا تعلق کلیتہً صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان پایا جاتا ہے۔ مذہب کا کام یہ نہیں کہ انسان کی دنیوی زندگی میں کسی طریق سے دخل انداز ہو، بلکہ اُس کے لیے صرف اسی قدر کافی ہے کہ اُس کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت سے لگا رہے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں مگر ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے خالق کو بھی خوش کر لیا جائے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے اور اس کا تعلق اپنے رب سے ایک دوسری چیز ہے، ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

عیسائیت کے اس تصورِ مذہب کے خلاف اب یہ دیکھیے کہ اسلام کونسا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔

اسلام میں مذہب کا مفہوم محض پوجا نہیں بلکہ بندگی ہے۔ اس لیے اس کی تعلیمات کا دائرہ صرف اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ وہ زندگی کا ایک جزو نہیں بلکہ تمام زندگی ہے، زندگی کی روح اور اس کی قوتِ محرکہ ہے، فکر و نظر ہے، صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہے، اس لحاظ سے مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں خواہ اُن کا تعلق اُن کی سیاسی زندگی سے ہو

یا اُن کی روحانی زندگی سے مستقل اقدار کے حامل ہیں۔ وہ ایک متعین اسلوبِ حیات اور اندازِ زیست کے مالک ہیں۔ اُن کا مسلمان ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ وہ زندگی کے سارے خانوں میں صرف اسلام کا رنگ بھریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اخلاق کے لیے ہی نہیں بلکہ زندگی کے سارے معاملات تہذیب و معاشرت، معیشت و اجتماع، آئین و سیاست، علم و فلسفہ کے لیے بھی نہایت واضح احکام صادر فرما دیئے ہیں۔ لہٰذا یہاں اس امر کا امکان بہت کم ہے کہ کوئی شخص بھی اپنے وضع کردہ نظریات کو الہامِ الٰہی کے طور پر پیش کر سکے۔ اگر کبھی اس قسم کی کوئی حرکت کی بھی گئی تو پوری امت نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس وقت تک چین نہ لیا جب تک کہ حقیقت نکھر کر سامنے نہ آگئی۔ چنانچہ بیرون صاحب کا مذہبی حکومت کے متعلق یہ خوف کہ یہاں مذہبی رہنماؤں کا گروہ اپنے افکار کو احکامِ خداوندی کی حیثیت سے انسانوں پر ٹھونسنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اسلام کے معاملہ میں بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

دوسرے اسلام روح اور مادہ کی ثنویت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک جسم اور روح ایک دوسرے کی ضد نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں۔ اسلام کی نظر میں رفعتِ اخلاق یہ نہیں کہ انسان اس دنیا کو چھوڑ دے، اس کی لذتوں اور رغبتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ اس کے برعکس اُس نے انسان کو یہ بات سجھائی ہے کہ یہ دنیا انسان ہی کے لیے بنائی گئی ہے، اور اس لیے اس کا فرض یہ ہے کہ اُس کو برتے اور خوب سمجھ کر برتے۔ مگر بُرے اور بھلے، حق و ناحق کو جان کر برتے، خدا نے اُسے شعور و آگہی کی جو قوتیں عطا کی ہیں اُن سے کام لے اور اپنے عمل سے ثابت کر دے کہ وہ ترغیبات کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں۔ یہ دنیا دار العمل ہے اور اس میں جو شخص اپنے باعمل ہونے کا ثبوت پیش نہیں کرتا، وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔ اسلام میں بندگی کسی غار میں بیٹھ کر ذکر و اذکار میں انہماک نہیں بلکہ یہاں زندگی کی کشاکش، بازاروں کے شور و شغب اور کاروبار کی مصروفیتوں میں رہ کر خدا کو نہ بھولنا اصل عبادت ہے۔ اسلام نے انسان کے فطری داعیات اور جذبات کو مٹانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اُن کو صحیح راہ پر لگانے کا ایک مربوط پروگرام دیا ہے۔ لہٰذا اس کا مقصد انسانی فطرت کا ازالہ نہیں بلکہ امالہ ہے۔ اُس نے صرف اس کا رخ شر سے خیر کی طرف پھیر دیا۔ اس کا بنیادی

عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کرام تبدیلِ فطرت کے لیے نہیں بلکہ تکمیلِ فطرت کے لیے مبعوث فرمائے گئے۔ تیسرے اسلام دین اور دنیا کی دوئی کے نظریہ کو بھی سراسر باطل قرار دیتا ہے۔ اس کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو "کلیدِ دین" سے "درِ دنیا" کو کھولنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کا ہر لمحہ اور لحظہ ملازم سمجھے۔ اُس کا سونا جاگنا، اس کا کھانا پینا، اس کا چلنا پھرنا غرض اُس کے سارے اعمال صرف اُسی ایک کی رضا اور خوشنودی کے لیے وقف ہوں۔ یہاں فلاح کا مدار حیاتِ اجتماعی سے فرار پر نہیں بلکہ اس کے منجدھار میں رہ کر اپنے خالق سے اپنی محبت اور وفاداری کے رشتہ کو قائم رکھنے پر ہے۔ اس کی نجات کا راز دنیا اور اُس کے تعلقات سے مُنہ موڑنے میں مضمر نہیں بلکہ اس میں ہے کہ وہ ہر قسم کے دنیاوی تعلقات میں بندھ کر، ان ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لدکر، خوف اور لالچ، بیم و رجا کے ماحول میں رہ کر، اپنے پیدا کرنے والے کے منشا کو پورا کرے۔ اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا جو راستہ بتایا ہے وہ سینٹ پال کی عیسائیت سے مختلف ہے۔ یہاں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا جنگلوں اور ویرانوں میں تلاش کرنے سے نہیں ملتا بلکہ انسانی بستیوں میں ملتا ہے۔ حضور سرورِ دو عالم نے اس باطل خیال کی پوری شدت سے تردید فرمائی ہے کہ مذہب انسانی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ اسی لیے اسلام نے اپنے پیش کردہ نظامِ حیات کا نام دین رکھا ہے۔ یہاں تمام دنیاوی اعمال خالص دینی نوعیت رکھتے ہیں۔ انسانی عمل کی کوئی شق، اخلاقی اور دینی عنصر سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ یہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ "انسانی تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں اور ان کی صحیح ترکیب پر ہی انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں۔ دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی

بناتے ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام ایک خاص طریقِ فکر اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جس کا راستہ اسی طریقِ فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریقِ فکر اور طرزِ عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہبِ اسلام ہے، وہی تہذیبِ اسلامی ہے اور وہی تمدنِ اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں وہی ایک طریقِ فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں، خود اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں، ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوعِ انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں۔ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے اور ایک شخص کا مسلمان ہونا اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا۔ غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک، طریقِ عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریقِ استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثارِ فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانینِ طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے، جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو[1]" یہاں انسان کی مذہبی اور سیاسی زندگی میں کوئی حدِ فاصل نہیں بلکہ دینِ حق ان دونوں کو ایک ہی سمجھتا ہے۔ یہاں قیصر کا کوئی حصہ نہیں بلکہ سارے کا سارا حصہ خالق کا ہے۔ اسلام نے دین اور دنیا کی دوئی کو مٹا کر فطرتِ انسانی کے اس بڑے راز کو آشکارا کیا ہے کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ ممکن ہے کہ دین کا یہ صحیح تصور ریون صاحب کی عقل میں نہ آسکے، مگر مسلم قوم اس حقیقت

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی : مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول

سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ جو مذہب اُسے اعتقادات اور عبادت کے طریقے بتاتا ہے، وہی اُسے معاشرتی تعلقات میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں اور سیاست ایسے میدان خارزار میں بھی راہنمائی دیتا ہے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں الگ ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیرات اور فروعات پر اصول کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے، جوہری اختلاف نہیں۔ جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے۔ اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے وہ کسی قسم کے اختلاف قبول نہیں کرتی۔

جناب بیون صاحب اگر ان تصریحات کا گہری نظر سے جائزہ لیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ مسلم قوم مذہب کو اپنی اجتماعی زندگی سے خارج کر کے اپنی تہذیب کو تو کیا اپنے وجود کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی، ملکی اور تمدنی امور میں مذہبی اندازِ فکر اور مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کرے یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لے جو اس کے مذہبی احساسات و تخیلات سے بالکل مغائر ہو۔ مذہب اور سیاست کے ایک ہونے کا احساس اس قوم میں اس قدر شدید اور گہرا ہے کہ مغرب کی ایک صدی کی براہِ راست فرمانروائی بھی اس تصور کو مٹا نہیں سکی۔ چنانچہ یورپ کی استعماری طاقتوں نے جب کبھی اس غلط تصور کو مسلمانوں میں زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی تو ان میں اس کے خلاف ایک شدید ردِّ عمل پیدا ہوا۔ غیر تو غیر خود ہماری ملت کے "ترک نادان" کو جو ایک وقت میں بڑا ہر دلعزیز اور مسلم قوم کا واحد نجات دہندہ سمجھا جاتا تھا اس باب میں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اُس نے حکومت کی طاقت سے اور اپنی مقبولیت سے سالہا سال تک اسلامی تصورات کی بیخ کنی اور مغربی تصورات کی آبیاری کی کوششیں کیں مگر اُن کے بعد بھی دیکھیے تو معاملہ وہیں کا وہیں ہے۔ بلکہ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ مصطفیٰ کمال کی سیاسی عزت کو بچانے کے لیے قانون کی قوت سے کام لیا جا رہا ہے۔ یہی حال مصر کا ہے۔ دین کی ہمہ گیری کا تصور ہزار تشدد کے باوجود ختم نہیں ہو سکا۔ پاکستان کے عوام میں تو یہ شعور اور بھی زیادہ گہرا ہے کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر انہوں نے آزادی کی جنگ

لڑی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک آزاد اور الگ ریاست کے مطالبہ کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ اس برِّ عظیم میں ہندو قوم کے سوا ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اگر صرف یہی بات ہوتی تو اس میں کوئی قباحت نہ تھی کہ وہ اپنے مذہب اور کلچر کو ایک حد تک محفوظ رکھ کر ہندوستانی قوم کا ایک جزو بننے پر راضی ہو جاتے۔ اس میں آخر کونسی چیز اُن کے مانع تھی کہ وہ اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی رسوم عبادات اور معاشرتی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے امورِ مملکت کے انصرام اور نظمِ اجتماعی کی تشکیل میں ہندوؤں کے ساتھ پورا پورا اشتراکِ عمل کر لیتے۔ کانگرس کے حامی بھی یہی کہتے کہ تم دوسری قوموں کی طرح اپنی مذہبی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستانی قوم میں آخر کیوں شامل نہیں ہوتے۔ اس کا جواب مسلم قوم کی طرف سے یہ دیا جاتا کہ ہم اپنی مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی میں کوئی تفریق نہیں کر سکتے، کیونکہ مذہب ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اصل اساس ہے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم مسلمان رہتے ہوئے سیاسی اور ملکی امور میں مذہب سے ہٹ کر کوئی کام کر سکیں۔ ہم آزادی کے اس لیے طلبگار ہیں کہ اسلامی نظامِ حیات کو بالفعل دنیا میں نافذ کر سکیں۔ یہ ہمارے دین کا عین اقتضا ہے۔ اس نظریہ میں مسلم قوم کے لیے اتنی کشش ہے کہ وہ اس کے بلاوے پر فوراً ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو گئی اور بڑی قربانیوں کے بعد اسلام کی اس "تجربہ گاہ" کو حاصل کیا۔ کیا بیون صاحب یہ چاہتے ہیں کہ اس نظریہ کو ترک کر کے ہم خدا سے بغاوت جیسے جرمِ عظیم کے ارتکاب کے ساتھ ساتھ اپنی پوری تاریخ پر خود اپنے ہاتھ سے خطِ تنسیخ کھینچ دیں۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

اس سلسلہ میں بیون صاحب کو یہ چیز بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اہلِ کلیسا نے تاریخ میں جو افسوسناک روایات چھوڑی ہیں مسلم قوم کی زندگی اُن سے بڑی حد تک پاک ہے۔ پہاڑی کے وعظ نے عیسائیوں کو ہر ظلم و تعدی کو خاموشی سے برداشت کرنے کا سبق دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف ہر قسم کی زیادتیوں کو بخوشی برداشت کرتے رہے، بلکہ اسی میں انہوں نے سعادت و فلاح بھی ڈھونڈنا چاہی، وقت کے فرمانرواؤں، اور مذہب کے اجارہ داروں نے اس موقع کو غنیمت جان کر کمزور

اور بے سہارا لوگوں کو اور ستانا شروع کیا۔ یہ لوگ مختلف طریقوں سے مال اور قوت جمع کر کے اس دنیا میں فرعون بنے جارہے تھے مگر کسی متقی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ مظلوموں کی فریادیں افلاک تک پہنچ رہی تھیں مگر کوئی پارسا ان سے متاثر نہ ہوتا۔ عوام ہلاکت اور بربادیوں کے جنگل میں گرفتار تھے مگر کسی پرہیزگار کی رگ حمیت نہ پھڑکتی۔ اہل مذہب کی ساری سرگرمیاں محض "گلیم خویش" کو بچانے تک محدود تھیں۔ دنیا اور اس کے متعلقہ امور نہایت ہی ذلیل اور بددیانت قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ جس طرح چاہتے ان معاملات کو طے کرتے اور کوئی ان پر گرفت کرنے والا نہ ہوتا۔ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال اچھی طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ لوگوں کی ہلاکت اور مظلومیت منشاء الٰہی کے عین مطابق ہے اس لیے کسی مقدس انسان کو خداوند تعالیٰ کے ارادہ میں دخیل ہو کر ظالموں کا ہاتھ نہیں روکنا چاہیے۔

اسلام کی تعلیم اس سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ اس کی عین ضد ہے۔ یہاں استبدادیت کے سامنے سپر ڈال دینے کی بجائے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ظلم و عدوان مالکِ ارض و سموات کے منشاء کے خلاف ہیں۔ اس لیے ایک مسلم کا یہ فرض ہے کہ انہیں اس دنیا سے جلد از جلد مٹانے کی سعی کرے۔ اسلام تو نام ہے اس یقین انگیز، ایمان پرور اور باطل شکن تحریک کا جس میں انسان ہر غیر الٰہی اور ظالمانہ نظام کو ختم کر کے رضائے الٰہی کے مطابق ایک پُرامن نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔

پھر اہلِ کلیسا کے برعکس علماء اسلام نے انسانوں کو اپنے بندھنوں میں جکڑنے کے بجائے انہیں ہر قسم کی محکومی سے نجات دلائی۔ انہی کی مساعی سے جبر و استبداد سرنگوں ہوئے۔ غلامی کی زنجیریں کٹیں اور انسان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ تمام جھوٹے خداؤں سے بغاوت کر کے صرف خدائے واحد کی بندگی اختیار کرے۔ یہ لوگ اہلِ کلیسا کی طرح عیش و عشرت میں منہمک ہو کر اپنا دماغی توازن نہیں کھو چکے تھے۔ بلکہ صحیح معنوں میں پہاڑی کا چراغ اور زمین کا نمک تھے۔ یہ لوگوں میں سب سے زیادہ دل کے سچے، علم کے گہرے اور تکلفات سے دُور تھے۔ یہ حضرات مسیحی پادریوں کی طرح کبھی بھی خوف و دہشت کی طاقت نہ بنے بلکہ نیکی اور عدل کے پیغامبر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے اور جب کسی فرد یا گروہ نے بھلائی کی اس روش کو ترک کر کے برائی کی راہ اختیار کی، تو خود اُس کے اپنے طبقہ میں اُس کی

رسوائی ہوئی۔ یہی وہ پاکباز انسان تھے جنہیں دکھوں سے چُور انسانیت نے اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ انہوں نے اولادِ آدم کی فلاح کے لیے جمشید اور قیصر و کسریٰ کے شاہانہ اختیارات کو چیلنج کیا۔ خسروانہ جلال اور غیر مسئول اقتدار کے سامنے بھی حق و صداقت کی آواز بلند کی۔ اور کئی بار جان تک کی بازی لگا کر انسانیت کے حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کا فرض سر انجام دیا۔ انہی کا پاک وجود ہزاروں سال تک ابتری اور ہلاکت کے راستہ میں ایک بڑی روک کا کام دیتا رہا اور انسانیت کو ان تمام فتنوں اور خطرات سے جو عالم پر محیط تھے عرصہ تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ نوعِ انسانی ان کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ ان لوگوں کے کردار کو پاپاؤں کی سیرت پر قیاس کر کے کوئی حکم لگانا تاریخ کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہے۔

تاریخ اسلام مذہب اور سائنس کی اُس غیر معقول کشمکش سے بھی قطعاً خالی ہے جس کا مظاہرہ عیسائیت نے کیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ علماء اسلام بعض اوقات فقہی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئے مگر سائنس دانوں پر اُن کے علمی انکشافات اور تجربات کی بنا پر کوئی ظلم اور زیادتی نہ کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ عین اُس وقت جب یورپ میں فلاسفہ اور سائنس دانوں کے خون اُن کی علمی تحقیقات کی وجہ سے بہائے جا رہے تھے، جب محکمۂ احتساب اُن کو زندہ جلا دینے کے احکام جاری کر رہا تھا تو اس وقت علماء اسلام خود فطرت کے رازہائے سربستہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ چنانچہ مسلم قوم ایسے بے شمار ناموں سے واقف ہے جو علمِ دین کے ماہر ہونے کے علاوہ اپنے عہد کے بہت بڑے فلسفی اور سائنس دان بھی تھے۔ رابرٹ برائی فالٹ اپنی کتاب "تشکیلِ انسانیت" میں اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "تاریخ انسانی میں شاید ہی کوئی دور ایسا گزرا ہو جب حکمراں طبقہ نے علم کے حصول کے لیے اس قدر اضطراب کا اظہار کیا ہو۔ خلفاء اور امرا اپنے دیوان سے دار المطالعہ اور معمل میں چلے جاتے اور ریاضی اور سائنس کے مسائل پر بڑے شوق سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ مسودات اور جڑی بوٹیوں سے لدے ہوئے قافلے بخارا اور مصر سے اندلس تک لائے جاتے۔ محض کتابوں کی تلاش میں ہندوستان اور قسطنطنیہ میں سفرا کو بھیجا جاتا۔ بعض اوقات مصنفین اور ریاضی دان

تاوانِ جنگ کے طور پر قبول کر لیے جاتے۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک مکتب بھی تھا۔ اصحاب علم کو بغیر کسی نسلی اور مذہبی تفریق کے قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔"

"دنیائے جدید کو عربوں کے تمدن نے سب سے قیمتی چیز جو عطا کی وہ سائنس ہے لیکن اس کے ثمرات سے بہت دیر میں فائدہ اٹھایا گیا۔ جب اندلس میں عربوں کا تمدن تاریکی میں چھپ گیا، اس کے ایک طویل عرصہ کے بعد یورپ کا وہ عظیم الشان تمدن ظہور میں آیا جو اسی عربی تمدن کا آفریدہ تھا۔ یہ صرف سائنس ہی نہ تھی جس نے یورپ کو نئی زندگی بخشی بلکہ اسلامی تمدن کے بکثرت ایسے اثرات پڑے جنہوں نے یورپ کی زندگی کو پہلے پہل تہذیب کی روشنی سے منور کیا۔"

اگرچہ یورپ کے نشوونما کا ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس پر اسلامی تہذیب کا قطعی اثر نہ پڑا ہو۔ لیکن یہ اثر اس قوت میں زیادہ واضح اور نمایاں ہے جسے عصر جدید کی مہتم بالشان خصوصیت یعنی علمی، طبعی اور سائنٹفک اسپرٹ کہا جاتا ہے[1]۔

ڈاکٹر گستاؤ لیبان ایک مشہور مستشرق اپنی کتاب "تمدن عرب" میں عربوں کی ان خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کے مقابل میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس وقت تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے۔ کل محققین یورپ علی الخصوص ہمبولڈ جنہوں نے عربی تصنیفات کو دیکھا ہے اب اس امر کے قائل ہیں۔ ہمبولڈ یہ لکھنے کے بعد کہ علمی ترقی کا اصل درجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے ارادہ سے یعنی بذریعہ تجربہ حوادث طبیعیہ پیدا کر سکے بطور تمثیل لکھتا ہے "عربوں نے یہ درجہ جس سے متقدمین بالکل ناواقف تھے حاصل کر لیا تھا۔"

"پس عربوں ہی نے علمی تحقیقات میں تجربہ کو داخل کیا اور ایک زمانہ تک صرف عرب ہی تھے جو اس طریقہ کو جانتے تھے۔ موسیو ڈیلامبر اپنی تاریخی ہیئت میں لکھتے ہیں کہ اگر یونانیوں میں

[1] THE MAKING OF HUMANITY

بمشکل دو یا تین آدمی اجرام سماوی کے مشاہدہ کرنے والے تھے تو عربوں میں برخلاف اس کے بکثرت ایسے لوگ موجود تھے۔ یونانیوں میں علم کیمیا کا تجربہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ برخلاف اس کے عربوں میں سینکڑوں تھے۔"

مجھے امید ہے کہ یہ تصریحات جو بیون صاحب کے اپنے بھائی بندوں نے پیش کی ہیں، اُن کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام علمی ترقی کا مخالف نہیں بلکہ مؤید ہے۔ علماءِ اسلام اہلِ کلیسا کی طرح ہر نئی تحقیق پر اصحابِ علم کو کافر ٹھہرا کر اُن پر عرصۂ حیات تنگ نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ یہی لوگ تھے جنہوں نے ان کی قدردانی کی، ان کے نتائج پر نقد کیا، اور انہیں اُن کی غلطیوں سے پورے دلائل کے ساتھ متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے عقل پر پہرے نہیں بٹھائے بلکہ اُسے چار چاند لگائے اور علم کو وحی و الہام کی روشنی میں آخری زینے تک پہنچایا۔ لہٰذا بیون صاحب کو اس معاملہ میں بالکل مطمئن ہونا چاہیے کہ یہ مذہبی دیوانے "علم و فن کے دشمن نہیں بلکہ جو کچھ علم اُن تک پہنچا ہے وہ سب انہی کی سعی و جہد کا نتیجہ ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر مَیں یہاں چند باتیں اسلامی ریاست کے بارے میں بھی عرض کر دوں۔ مذہبی ریاست کا نام سنتے ہی آج کل کے "اہلِ نظر" کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کا نقشہ پھرنے لگتا ہے کہ چند جاہل، مذہبی سرپھرے، پُرغضب چہروں، چڑھی ہوئی تیوریوں اور شرر فشاں آنکھوں کے ساتھ مسندِ اقتدار پر قابض ہو گئے ہیں اور اُن کا مقصدِ حیات یہی ہے کہ وہ ترقی کی راہ روک کر بیٹھ جائیں، معصوم اور بھولے بھالے عوام کو خدا اور آخرت کا نام لے لے کر ڈرائیں اور اُن کے گاڑھے پسینے سے حاصل کی ہوئی کمائی کو ذاتی آرام و آسائش پر بے دریغ صرف کریں۔" اگر گستاخی معاف ہو تو عرض کر دوں کہ مذہبی حکومت کا یہ گھناؤنا نقشہ عہدِ حاضر کے اُن زرخیز دماغوں کی کرشمہ سازی ہے جو خود پچھلے دو سو سال سے ہر قسم کے اسلحہ کے ساتھ قزاقوں کی طرح کمزوروں کو لوٹ رہے ہیں، جن کی تنگ نظری، زیادتی اور مردم آزاری نے آج پوری نوعِ انسانی کے لیے جینا محال کر دیا ہے۔ جن کی چیرہ دستیوں، تصادموں اور چالبازیوں کی ساری مخلوقِ خدا نوحہ خواں ہے۔

پھر اگر ان کے بنائے ہوئے اس نقشہ کو چند منٹوں کے لیے صحیح بھی مان لیا جائے تو آخر یہ کہاں لازم

آتا ہے کہ مذہبی ریاست کی ہر جگہ یہی ایک شکل رہی جس طرح محض کسی ریاست کا لادینی ہونا اس کے کسی ایک مخصوص ڈھانچہ کی ضمانت قرار نہیں دیا جا سکتا، بالکل اسی طرح کسی ریاست کے مذہبی ہونے کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ اس کی تشکیل لازماً یورپ کی عیسائی ریاستوں کے طرز پر ہی ہونی چاہیے۔ اگر مغرب میں ان ریاستوں نے کمزوروں پر مظالم ڈھائے تو اس کے برعکس مشرق میں انہی حکومتوں نے شہنشاہیت کے ستائے ہوئے لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دی، ایک خدا کے تحت اقتدار کو زمین پر پھیلایا اور دنیا بھر کی سطوت و خدائی کو ختم کیا۔ پندار و غرور نے الوہیت و خدائی کی جتنی صورتیں اختیار کر رکھی تھیں انہیں چُن چُن کر مٹایا اور انسان کو موقع دیا کہ وہ ایک بہتر اور آزاد زندگی بسر کر سکے۔ چنانچہ رابرٹ براؤن فالٹ نے اس سلسلہ میں بالکل درست کہا ہے۔

"مغرب میں مذہبی حکومت کا خواہ کچھ ہی تصور ہو۔ مگر مشرق میں یہ حکومت کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ ہم یہاں ظلمت پسندی، خیالات پر قدغن اور علم پر پابندی کی کوئی مثال نہیں پاتے جس کے لیے مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور ہے۔"

یورپ جس مذہبی حکومت سے واقف ہے، اسلام اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ میں تھیا کریسی سے مراد وہ ریاست ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ کو فرمانروائی کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوں اور وہ عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر سکے۔ اس کے برعکس اسلام جس تھیا کریسی کا تصور پیش کرتا ہے اس میں خداوند تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کے تحت سارے مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت عطا کی گئی ہے۔ یہ حق کسی ایک گروہ کو تفویض نہیں کیا گیا بلکہ ہر مسلمان اس زمین پر خدا کا نائب، شاہد علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں براہ راست خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ یہاں عاملہ صرف ایک فرد یا گروہ کی رائے سے نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ پوری امتِ اسلامیہ میں سے ہر شخص خواہ اس کی دنیاوی حیثیت

کچھ ہی ہو اس بات کا مستحق ہوگا کہ وہ اس میں اپنی رائے پیش کر سکے۔ اس لیے اس حکومت کو تھیاکریسی کی بجائے اگر الٰہی جمہوری حکومت (THEO-DEMOCRACY) کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔[1]

اس کے علاوہ اس ریاست کا دائرۂ کار، یورپ کی مذہبی ریاستوں سے بھی بہت مختلف ہے۔ وہاں تو فرمانرواؤں کا فرض صرف اسی قدر تھا کہ وہ عوام پر زیادہ سے زیادہ ظلم کرکے انہیں نجاتِ اُخروی کے لیے تیار کرنے۔ مگر یہاں اُن کے فرائض بالکل دوسری نوعیت کے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں ہیں اُن کا فرض ہے کہ وہ اس ریاست کی حدود کے اندر ہر قسم کے ظلم و عدوان، فتنہ و فساد کو ختم کرکے، باہمی محبت و وفاکیشی ایسے جذبات کو پروان چڑھائیں۔ یہاں بھلائی کو فروغ دیں اور بُرائی کو اپنی تمام شکلوں میں مٹائیں۔ ان حضرات پر عوام کے کچھ حقوق کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جان و مال، آبرو کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس ریاست میں بسنے والے انسانوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری کی جائیں۔ اس معاملہ میں چھوٹے بڑے، امیر و غریب، مسلم یا غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ ان میں اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی صاحب اسلامی حکومت کو یورپ کی تھیاکریسی پر قیاس کرکے کوئی فیصلہ دینے پر مصر ہوں تو آخر اس کا کیا علاج کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں ایک دو باتیں جماعتِ اسلامی کے بارے میں بھی عرض کی جاتی ہیں۔ یہ جماعت جس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

> "انسانی زندگی کے پورے نظام کو اس کے تمام شعبوں (فکر و نظر، عقیدہ و خیال، مذہب و اخلاق، سیرت و کردار، تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، تمدن و معاشرت، معیشت و سیاست، قانون و عدالت، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات) سمیت خدا کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت پر قائم کیا جائے۔"

یہ مقصد روزِ اول سے جماعت کے پیشِ نظر رہا ہے اور آج بھی یہی ایک مقصد ہے جس کے لیے یہ کام کر رہی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مقصد نہ اس کے پیشِ نظر کبھی تھا نہ آج ہے نہ ان شاء اللہ کبھی ہوگا۔

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی

آج تک جس کام سے اس نے دلچسپی لی ہے اسی مقصد کے لیے لی ہے۔

"وہ جس چیز کو یہ جماعت قائم کرنا چاہتی ہے اُس کا جامع نام قرآن کی اصطلاح میں دین حق ہے یعنی وہ نظام زندگی جو تمام پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق اللہ کی بندگی و اطاعت پر مبنی ہے۔

ہمارے نزدیک اسلام اُن لوگوں کی جائداد نہیں ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں بلکہ خدا نے یہ نعمت اُن سب کے لیے بھیجی ہے جو انسان پیدا ہوتے ہیں خواہ وہ روئے زمین کے کسی خطے میں بستے ہوں۔ اس بنا پر ہمارا مقصد محض مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کی زندگی کو دین حق پر قائم کرنا ہے۔ مقصد کی یہ وسعت آپ سے آپ تقاضا کرتی ہے کہ ہمارا اپیل عام ہے اور کسی مخصوص قوم کے مفاد کو مدنظر رکھ کر کوئی ایسا عمل نہ اختیار کیا جائے جو اسلام کے اس عام اپیل کو نقصان پہنچانے والا ہو یا اس کی نقیض واقع ہو۔ مسلمانوں سے ہم کو دلچسپی اس بنا پر نہیں ہے کہ ہم اُن میں پیدا ہوئے اور وہ ہماری قوم ہیں، بلکہ اُن کے ساتھ ہماری دلچسپی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کو مانتے ہیں، دنیا میں اس کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں، نوع انسانی تک اس کا پیغام پہنچانے کے لیے انہی کو ذریعہ بنایا جا سکتا ہے اور دوسروں کے لیے اس پیغام کو موثر بنانا اس کے بغیر ممکن بھی نہیں ہے کہ جو لوگ پہلے سے مسلمان ہیں وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں پورے اسلام کا نقشہ پیش کریں۔

ہم نے اپنے مقصد کے لحاظ سے اپنی تحریک کو اس طرز پر اُٹھایا ہے کہ ایک طرف اس کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام رہے، اور دوسری طرف مسلمانوں کو اسلام کی مکمل اور صحیح علمی اور عملی شہادت دینے کے لیے تیار کیا جائے[1]"

جس طرح ہمارا مقصد دوسری قوموں اور جماعتوں کے مقاصد سے مختلف ہے اسی طرح ہمارا طریق کار بھی دوسروں سے الگ ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ نیک مقاصد صرف جائز طریقوں سے ہی حاصل کیے جا سکتے

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی: جماعت اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل

ہیں۔ اگر مجھے علمِ اخلاق (ETHICS) کی اصطلاح استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں عرض کرونگا کہ ہم مقصد اور ذرائع دونوں پر فتویٰ (JUDGEMENT) لگاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کسی صحیح نصب العین تک غلط راستوں سے نہیں پہنچا جاسکتا۔ اسی لیے ہم تمام آئینی اور جمہوری ذرائع کو بروئے کار لاکر رائے عامہ کو اس انقلاب کے حق میں ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے تحریری دستور میں یہ چیز غیر مبہم الفاظ میں یوں درج ہے:-

"اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے یہ جماعت کبھی ایسے ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کریگی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو۔" (دفعہ ۱۰ شق نمبر ۲)

"جماعت اپنے پیش نظر اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعہ سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو اُن تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیشِ نظر ہیں" (دفعہ ۱۰ شق ۳)

"جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کریگی بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی" (دفعہ ۱۰ شق نمبر ۴)

بقیہ تزکیہ نفس ص

ہر علم علم ہے، ہر چیز کے پڑھنے پڑھانے والوں سے مدرسے اور کالج بھرے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ گندے سے گندے رسالے اور ناپاک سے ناپاک افسانے بھی لاکھوں کی تعداد میں اس ملک کے اندر چھپتے اور بکتے ہیں اور لوگ ان کو خریدتے اور پڑھتے ہیں لیکن اگر کسی علم کے پڑھنے پڑھانے والے مفقود ہیں تو یہ وہ علم ہے جس کو اللہ اور رسول کا علم کہا جاتا ہے۔ یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔

رسائل و مسائل

زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک

[جناب خان محمد صاحب ربانی (ملتان) کا ایک مضمون "علماء کرام سے چند سوالات" کے زیرِ عنوان محرم ۷۳ھ کے "ترجمان" میں (تیز تسنیم" میں) شائع ہوا تھا جہاں تک ہمیں معلوم ہے ابھی تک ان سوالات کا کسی جانب سے جواب نہیں دیا گیا۔ جیل کے ذمہ داران کی وساطت سے یہ سوالات مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی تک پہنچا کر اُن سے بھی اس بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔ مولانا محترم نے ان سوالات سے متعلق اپنی رائے تحریر فرمائی ہے، جو سنسر ہونے کے بعد جیل سے باہر آئی ہے۔ ہم اسے بھی "ترجمان" میں شائع کر رہے ہیں تاکہ "مسئلہ تملیک" کے سارے پہلو سامنے آجائیں اور جو حضرات علم بھی ربانی صاحب کے اٹھائے ہوئے سوالات کا جواب دینا چاہیں وہ جواب دیتے وقت ان تنقیحات کو بھی پیشِ نظر رکھیں جو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے پیش کی ہیں۔]

زکوٰۃ کے متعلق جناب خان محمد صاحب ربّانی کے سوالات میرے علم میں لائے گئے ہیں اور مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ اس معاملے میں میری تحقیق کیا ہے۔ مختصراً میں اپنی رائے عرض کرتا ہوں۔

جس فتوے پر یہ سوالات کیے گئے ہیں، میرے نزدیک وہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ... الخ کی اس تاویل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے جو حنفیہ نے اختیار فرمائی ہے۔ اس مطلب کو سمجھنے کے لیے آیت کے الفاظ پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ	صدقات تو فقراء کے لیے ہیں اور مساکین کے لیے
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ	اور اُن لوگوں کے لیے جو اُن پر کام کرنے والے ہوں

قُلُوْبُهُمْ ... الخ اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مقصود ہو... الخ

دیکھیے یہاں لام کا عمل صرف فقراء ہی پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ مساکین، عاملین علیہا اور مولفۃ قلوبہم پر بھی ہو رہا ہے۔ یہ لام تملیک کے لیے ہے تو، اور استحقاق یا اختصاص یا کسی اور معنی کے لیے ہے تو، بہر صورت جس معنی میں بھی وہ فقراء سے متعلق ہو گا اسی معنی میں باقی تینوں سے بھی متعلق ہو گا۔ اب اگر حنفی تاویل کے لحاظ سے وہ تملیک کا مقتضی ہے تو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کا مال ان چاروں میں سے جس کے حوالے بھی کر دیا جائے گا تملیک کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ آگے تملیک در تملیک کا حکم کہاں سے نکالا جاتا ہے؟ کیا فقیر یا مسکین کی ملک میں زکوٰۃ کا مال پہنچ جانے کے بعد اس کے تصرفات پر کوئی پابندی ہے؟ اگر نہیں تو عاملین علیہا کے ہاتھ میں مال پہنچ جانے کے بعد، جبکہ لام تملیک کا تقاضا پورا ہو چکا، پھر مزید تملیک کی پابندی لگانے کے لیے کیا دلیل ہے؟

لام کو اگر تملیک ہی کے معنی میں لیا جاتے تو ایک شخص جب زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کے اموال عاملین علیہا کے سپرد کر دیتا ہے تو گویا وہ انہیں اس کا مالک بنا دیتا ہے، اور یہ اسی طرح ان کی ملک بن جاتے ہیں جس طرح فئے اور غنیمت کے اموال حکومت کی ملک بنتے ہیں، پھر ان پر یہ لازم نہیں رہتا کہ وہ ان اموال کو آگے جن مستحقین پر بھی صرف کریں بصورتِ تملیک ہی کریں۔ بلکہ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ باقی ماندہ سات مصارفِ زکوٰۃ میں اس کو جس طرح مناسب اور ضروری سمجھیں صرف کریں۔ لامِ تملیک کے زور سے اُن پر کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ جو قید لگائی جا سکتی ہے وہ صرف یہ کہ جو شخص بھی زکوٰۃ کی تحصیل و صرف کے سلسلے میں کوئی عمل کرے وہ بس اس عمل کی اُجرت لے لے۔ باقی مال اُسے دوسرے مستحقینِ زکوٰۃ پر صرف کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ یہ لوگ عاملین علیہا ہونے کی حیثیت سے ان اموال کے مالک بنائے جاتے ہیں نہ کہ بجائے خود مستحق ہونے کی حیثیت سے۔ "عاملین علیہا" کا لفظ خود اس وجہ کو ظاہر کر دیتا ہے جس کے لیے زکوٰۃ ان کے حوالے کی جاتی ہے، اور پھر یہی لفظ یہ بھی طے کر دیتا ہے کہ وہ عامل ہونے کی حیثیت سے اس مال کا کتنا حصہ جائز طور پر اپنے ذاتی تصرف میں لانے کا حق رکھتے ہیں۔

اس تشریح کے بعد اُس حدیث پر نگاہ ڈالیے جو امام احمد نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کی ہے۔ اس میں حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اذا ادیتُ الزکوٰۃَ الی رسولک فقد برئتُ منہا الی اللہ و رسولہ "جب میں نے آپ کے بھیجے ہوئے عامل کو زکوٰۃ ادا کر دی تو میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنے فرض سے بری الذمہ ہو گیا نا؟" حضور نے جواب دیا "نعم، اذا ادیتہا الی رسولی فقد برئتَ منہا الی اللہ و رسولہٖ فلک اجرہا و اثمہا علی من بدلہا" "ہاں! جب تُو نے اسے میرے فرستادہ عامل کے حوالہ کر دیا تو تُو اللہ اور اس کے رسول کے آگے اپنے فرض سے بری الذمہ ہو گیا۔ اس کا اجر تیرے لیے ہے اور جو اس میں ناجائز تصرف کرے اس کا گناہ اسی پر ہے"۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ دینے والا اپنی زکوٰۃ عاملین علیہا کے سپرد کر کے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر لامِ تملیک کا تقاضا جس طرح کسی فقیر یا مسکین کو زکوٰۃ دینے سے پورا ہوتا ہے اسی طرح عاملین علیہا کو دے دینے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اب یہ فتویٰ کس بنیاد پر دیا جاتا ہے کہ عاملین علیہا اگر تملیک ہی کے طریقے پر اموالِ زکوٰۃ کو صرف کرتے ہوں تو انہیں زکوٰۃ دو ورنہ نہیں؟ زکوٰۃ دینے والوں پر یہ دیکھنا کس نے فرض کیا ہے کہ عاملین کس طریقے پر عمل کرتے ہیں؟ اُن کا فرض صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مستحقین کو، یا اُن کے لیے کام کرنے والے عاملین کو اپنے اموالِ زکوٰۃ کا مالک بنا دیں۔ عاملین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ جس شخص کو اس حیثیت سے زکوٰۃ دی جا رہی ہو اس کے بارے میں زکوٰۃ دینے والا یہ اطمینان کر لے کہ وہ واقعی "عامل" ہے یا نہیں۔ حکومت اسلامی موجود ہو، اور اس نے عاملینِ زکوٰۃ مقرر کیے ہوں تو اُن کے پاس حکومت کی طرف سے تحصیلِ زکوٰۃ کا پروانہ موجود ہونا ہی اس اطمینان کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر یہ صورت نہ ہو اور مسلمانوں کی کسی اجتماعی تنظیم نے بطور خود زکوٰۃ کی تحصیل و صرف کا بندوبست کیا ہو تو اس کے بارے میں بس یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ وہ واقعی مستحقینِ زکوٰۃ پر اس مال کو صرف کرتی ہے۔ اور "عمل" کے مصارف اسی حد تک لیتی ہے جنہیں جائز و معقول کہا جا سکے۔ تحقیق سے ان باتوں کا اطمینان ہو جائے

تو اس کو زکوٰۃ دینے والا یقیناً فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ کوئی شرعی دلیل مجھے ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر زکوٰۃ دینے والوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ عاملین علیہا کو زکوٰۃ دینے سے پہلے یہ بھی تحقیق کریں کہ وہ اموالِ زکوٰۃ کو بطریقِ تملیک صرف کرتے ہیں یا نہیں۔

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ "عاملین علیہا" کے الفاظ جو قرآن میں ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اُن کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے۔ لوگ اسے صرف اُن کارندوں تک محدود سمجھتے ہیں جن کو حکومتِ اسلامی اس کام کے لیے مقرر کرے۔ لیکن قرآن کے الفاظ عام ہیں جن کا اطلاق ہر اُس شخص پر ہو سکتا ہے جو زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے سلسلے میں "عمل" کرے۔ اس عام کو خاص کرنے والی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر حکومتِ اسلامی موجود نہ ہو، یا ہو مگر اس فرض سے غافل ہو، اور مسلمانوں میں کوئی گروہ یہ "عمل" کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو، تو آخر کس دلیل سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہیں تم "عاملین علیہا" نہیں ہو۔ میرے نزدیک تو یہ اللہ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے کہ اُس نے عاملین حکومت کے لیے خاص کرنے کے بجائے اپنا حکم ایسے عام الفاظ میں دیا ہے جن میں یہ گنجائش پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر موجودگی یا غافل حکمرانوں کی موجودگی میں مسلمان بطورِ خود بھی زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لیے مختلف انتظامات کر سکیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے اس عام حکم کو عام ہی رہنے دیا جائے تو غریب طلبا کی تعلیم، یتیموں کی پرورش، بڈھوں اور معذوروں اور اپاہجوں کی نگہداشت، نادار مریضوں کے علاج، اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے لیے جو ادارے قائم ہوں، اُن سب کے منتظمین بالکل بجا طور پر "عاملین علیہا" کی تعریف میں آئیں گے، اور اُن کو زکوٰۃ لینے اور حسبِ ضرورت صرف کرنے کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے، اور اُن حیلہ بازیوں کی کوئی حاجت باقی نہ رہے گی جو آج کل ہمارے عربی مدرسوں کے مہتمم حضرات زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اس طرح ایسے ادارات قائم کرنے کی بھی گنجائش نکل آئے گی جو خاص طور پر تحصیل و صرفِ زکوٰۃ ہی کے لیے قائم ہوں۔ اُن کے منتظمین بھی "عاملین علیہا" قرار پائیں گے۔ اور صرف زکوٰۃ کے معاملے میں اُن کے ہاتھ بھی تملیک کے فتوے سے باندھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

میرے نزدیک اگر قرآن کے الفاظ کی عمومیت نگاہ میں رکھی جائے۔ تو صرف مذکورۂ بالا عاملین ہی

پر اُن کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ دوسرے بہت سے کارکن بھی اس تعریف میں آتے ہیں، مثلاً :

ایک یتیم کا ولی، ایک بیمار یا اپاہج کی خبر گیری کرنے والا، اور ایک بیکس بوڑھے کا نگہبان بھی "عامل" ہے، اسے زکوٰۃ وصول کر کے ان لوگوں کی ضروریات پر خرچ کرنے کا حق ہے، اور اس میں سے معروف طریقے پر اپنے عمل کی اُجرت بھی وہ چاہے تو لے سکتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئے تو اس میں ڈاک خانے یا بنک کو اُجرت دی جا سکتی ہے، کیونکہ اس خدمت کو انجام دینے کی حد تک وہ بھی "عاملین علیہا" ہونگے۔

زکوٰۃ وصول کرنے، یا زکوٰۃ کے اموال ایک جگہ سے دوسری جگہ حسب ضرورت لے جانے، یا مستحقین زکوٰۃ کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے ریل، بس، ٹرک، تانگے، ٹھیلے وغیرہ جو استعمال کیے جائیں اُن کے کرائے مالِ زکوٰۃ سے دیئے جا سکتے ہیں، کیونکہ یہ خدمات انجام دیتے وقت یہ سب "عاملین علیہا" میں ہی شمار ہونگے۔

مستحقینِ زکوٰۃ کی خدمت کے لیے جس قدر بھی ملازم اور مزدور استعمال کیے جائیں گے ان سب کی تنخواہیں اور اُجرتیں زکوٰۃ کی مد سے دی جا سکتی ہیں، کیونکہ وہ سب عاملین علیہا میں داخل ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کوئی ریلوے سٹیشن پر زکوٰۃ کے غلے کی بوریاں ڈھوئے، یا کوئی غریب مریضوں کی خدمت کے لیے گاڑی چلائے، یا کوئی یتیم بچوں کی نگہداشت کرے۔

اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا عاملین علیہا کے تصرفات پر کوئی ایسی پابندی ہے کہ وہ مستحقین زکوٰۃ کی خدمت کے لیے عمارات نہ بنوا سکیں اور اشیائے ضرورت، مثلاً گاڑیاں، دوائیں، آلات، کپڑے وغیرہ نہ خرید سکیں؟ میں کہتا ہوں کہ حنفی تاویلِ آیت کے لحاظ سے یہ پابندی صرف زکوٰۃ ادا کرنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ وہ خود بلاشبہ ان تصرفات میں سے کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی رُو سے زکوٰۃ "جن کے لیے" ہے اُن کی یا اُن میں سے کسی کی ملک میں دے دیں۔ رہے "عاملین علیہا" تو ان پر اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی وہ تمام مستحقین زکوٰۃ کے لیے بمنزلہ ولی یا وکیل ہیں۔ اور اصل مستحق اس مال میں جتنے

تصرفات کر سکتا ہے وہ سب تصرفات اُس کے ولی یا وکیل ہونے کی حیثیت سے یہ بھی کر سکتے ہیں۔ جب فقراء و مساکین کی ضروریات کے لیے کوئی عمارت بنائیں یا کوئی گاڑی خریدیں، تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بہت سے فقیروں اور مسکینوں نے، جن کو فرداً فرداً زکوٰۃ ملی تھی، باہم مل کر ایک عمارت بنوالی، یا ایک سواری خرید لی۔ جس طرح اُن کے اس تصرف پر کوئی پابندی نہیں ہے اس طرح اُن کے وکیل یا ولی پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ عاملین علیہا کو زکوٰۃ دینے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے مقرر کیا ہے، اور اللہ کے رسول نے اسی لیے اُن کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے والے کو فرض سے سبکدوش قرار دیا ہے کہ انہیں یہ مال دے دینا گویا تمام مستحقین کو دے دینا ہے۔ وہ اُنہی کی طرف سے اُسے وصول کرتے ہیں اور اُنہی کے نائب و سرپرست بن کر اُسے صرف کرتے ہیں۔ آپ اُن کے تصرفات پر اس حیثیت سے ضرور اعتراض کر سکتے ہیں کہ تم نے فلاں خرچ بلا ضرورت کیا، یا فلاں چیز پر ضرورت سے زیادہ خرچ کر دیا، یا اپنے عمل کی اُجرت معتدل حد سے زیادہ لے لی، یا کسی عامل کو معقول شرح سے زیادہ اُجرت دے دی۔ لیکن کوئی قاعدۂ شرعی میرے علم میں ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر اُن کو اس بات کا پابند کیا جا سکے کہ فلاں فلاں قسم کے تصرفات تم کر سکتے ہو اور فلاں قسم کے نہیں کر سکتے۔ قواعدِ شریعت انہیں ہر اُس کام کی اجازت دیتے ہیں جس کی مستحقینِ زکوٰۃ کے لیے ضرورت ہو۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اس معاملے میں اصل حل طلب سوالات صرف دو ہیں:۔

ایک یہ کہ اگر زکوٰۃ دینے والوں اور زکوٰۃ کا استحقاق رکھنے والوں کی رضامندی سے چند غیر سرکاری آدمی زکوٰۃ پر کام کریں تو آیا وہ قرآن کے ارشاد کے مطابق عاملین علیہا کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں؟

دوسرے یہ کہ عاملین علیہا کے ہاتھ میں زکوٰۃ دے دینے کے بعد ان کے تصرفات پر پھر تملیک کی قید عائد کرنے کے لیے کیا دلیل ہے؟

علمائے کرام کو انہی دو سوالات پر غور کر کے کوئی فیصلہ دینا چاہیے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی)

درود کی حقیقت

سوال ۔گزشتہ اگست میں رسالہ ترجمان القرآن کے مطالعہ کا شوق چرایا۔ وجہ تحرک یہ ہوئی کہ میں دو تین سال سے طلوع اسلام کے مسلک کا ہمنوا تھا۔ وہاں کچھ ایسے راز سربستہ پائے گئے جن کے انکشاف، دینی نظریے کے لیے از بس تھے۔ میں چاہتا تھا کہ یک طرفہ بیانات پر کسی بھی نظریے کو منسلک نہ کروں ۔۔ الا یہ کہ فریق ثانی کے دلائل نہ سنے جائیں۔ رسالہ باقاعدہ آتا رہا اور میں اس کے مطالعہ سے ایک گونہ تسکین پاتا رہا۔ ہاں، ہاں! آپ "درود" پر میری تشفی فرمائیں کہ "اللہ اور اس کے ملائکہ رسول مدنی پر درود بھیجتے ہیں، مسلمانو! تم بھی رسول اللہ پر درود بھیجو!" تو اس کا عملی پہلو بہر جا کیا مراد ہوتا ہے؟ خدا کے درود بھیجنے سے کیا، اور امت کے درود بھیجنے میں کیا کیا فرق ہیں اور درود ہے کیا چیز! یہ کوئی الفاظ کی گردان ہے یا یہ کہ عقیدت ہے، یا کوئی اور مادی یا روحانی شے ہے؟ دینی لحاظ سے میری تشفی کی جائے۔"

جواب :۔ اہم سے اہم چیز کا جب "مذاق" اڑایا جانے لگتا ہے تو سب سے پہلے اس کا ذہنی وقار مجروح ہوتا ہے اور اسے اختیار کرنے والا آدمی احساس کہتری کی زد پر آجاتا ہے۔ اس کے بعد اسے اس چیز کی مقبولیت میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مناظرہ باز اور فتنہ لپٹ حضرات کبھی اس پر اکتفا نہیں کرتے کہ وہ سائنٹفک اور علمی طریق پر کسی نظریے یا تصور کے بارے میں سنجیدہ بحث کریں، وہ بازاری انداز سے تضحیک و استہزاء کا پورا پورا حملہ کرتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ دلائل لڑاتے ہیں۔ یہی روش امور دینیہ کے بارے میں نیاز فتح پوری صاحب کی تھی اور یہی اب نئے پاکستانی "نیازوں" کی ہے۔ یہ دینی حقائق اور قرآنی معارف بیان کرنے سے پہلے ستر مرتبہ قدیم و جدید علمائے حق کو "ملا" اور "مادہ ملا" کی گالی دیں گے، پھر جس مسئلے کو چھیڑیں گے اس پر "ملائی سازش" اور

"عجمی فتنے" کی پھبتیاں کسیں گے، اور اس طرح کے پے در پے حملوں سے مخاطب کے ذہن کو پریشان کرتے ہوئے دلیل بازی فرمائیں گے۔ ٹھیک اسی طرح درود پر بھی "الفاظ کی گردان" جیسے بازاری فقرے چست کر کے جب ایک مرتبہ اس شعارِ دینی کے وقار کو زخمی کر چکیں گے تو اوپر سے دلائل کے ذریعے نمک چھڑکیں گے۔

آپ اسی "الفاظ کی گردان" کی پھبتی کو لیجیے! اسے جس طرح درود کے کلمات پر چست کیا جا سکتا ہے اسی طرح کلمۂ طیبہ پر، اذان کے جملوں پر، نماز کے تمام الفاظ پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ اور قرآن کی دوسری سورتوں پر بھی کیا جا سکتا ہے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر کیا ان میں سے ہر چیز کی اہمیت اور قدر و قیمت ختم ہو جائے گی؟

کلمۂ طیبہ ہو، نماز ہو، اذان ہو، قرأت ہو، دوسرے اذکار ہوں یا درود و صلوات ہو، اُن کو شریعت نے ہمارے معمول میں اس لیے داخل کیا ہے کہ جس طرح خیالات، جذبات اور احساسات پیدا ہو کر الفاظ میں ڈھلتے ہیں، اسی طرح جب کچھ متعین الفاظ کہے جاتے ہیں اور بشرطیکہ وہ معنی کو جان کر اور غور و فکر کرتے ہوئے کہے جائیں، اور یہی ہے مطلوبِ شریعت، تو ان کو کہتے ہوئے وہ خیالات، جذبات اور احساسات ابھرتے ہیں جن کی ترجمانی ان الفاظ کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ مثلاً جیسے "تاج محل" کا تصور ذہن میں آتے ہی یہ لفظ بھی ابھر آتا ہے، اسی طرح جب ہم یہ لفظ بولتے ہیں یا کسی سے سنتے ہیں تو اس صورت میں تاج محل کا تصور بھی از خود نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ وہی نفسیاتی حقیقت ہے جس سے انسانیت نے ہمیشہ — چاہے کوئی بھی نظام ہو — کام لیا ہے۔ مثلاً بادشاہوں اور حکمرانوں اور مختلف عہدہ داروں کے لیے خاص مؤدبانہ کلماتِ خطاب کا استعمال، قوم اور ملک کی عظمت کو نمایاں کرنے والے خاص الفاظ بولنا یا لکھ کے آویزاں کرنا، قومی ترانے کا گایا جانا، حلفِ وفاداری کے متعین الفاظ زبان سے ادا کرنا اور کرانا، وغیرہ۔ اسلامی نظامِ حیات میں اسی نفسیاتی حقیقت کی بنا پر "ذکر" کی مختلف واجب اور مستحب اقسام استوار ہیں۔ ہم جب نمازوں، اذانوں اور دعاؤں میں خدا تعالیٰ کی ذات اور صفات، اس کے دین کے اصولوں، اس کے نبی کے مرتبے، آخرت کی فلاح، قرآن کی آیات وغیرہ کو بیان کرتے ہیں تو یہ اس لیے کرتے ہیں کہ بولے جانے والے الفاظ کی معنوی حقیقت ذہن میں ساتھ ساتھ ابھرے۔ ہم خدا سے اپنی وفاداری اور طاعت و عبودیت اور

اتباعِ رسالت کا بار بار پیمان اگر الفاظ میں باندھتے ہیں تو اس لیے باندھتے ہیں کہ اس پیمان کی حقیقت ہمارے قلوب کو منور کرتی جائے۔

یہ ہے وہ حقیقت جسے نہ جاننے کی وجہ سے کچھ حضرات خود راستہ گم کر چکے ہیں اور دوسروں کی رہنمائی کر کے انہیں بھی ساتھ لے ڈوبنا چاہتے ہیں۔

اب لیجیے درود کی حقیقت! انسانی فطرت میں محسن کے لیے جذبۂ اعتراف پایا جاتا ہے اور یہ جذبہ ہمیشہ تحریک کرتا ہے کہ احسان کا جواب بقدرِ استطاعت احسان ہی سے دیا جائے۔ ایک بھٹکے ہوئے شخص کو جب کوئی راستہ دکھا دیتا ہے تو اس میں جذبۂ تشکر و سپاس ابھرتا ہے۔ اسی طرح خدا کے جس رسولؐ نے ایک مسلمان کو اس کے خدا سے ملا دیا ہو، اسے دنیا کی صداقتِ عظمیٰ کا علم دیا ہو، اسے زندگی بسر کرنے کی سیدھی راہ دکھا دی ہو، اسے اونچی اخلاقی قدروں سے بہرہ ور کیا ہو، اسے حلال و حرام کی تمیز سکھائی ہو، کیا اس احسانِ عظیم کے جواب میں آدمی میں اعتراف، سپاس اور تشکر کا کوئی جذبہ نہ ابھرنا چاہیے؟ لازماً ابھرنا چاہیے، اور نہ ابھرے تو گویا ایک بدبخت آدمی کی انسانی فطرت قطعی طور پر مسخ شدہ ہے۔ اس فطری جذبہ کے ظہور کے لیے شریعت نے جو راستے بتائے ہیں وہ یہ ہیں:-

—— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اور بے چون و چرا اطاعت اور آپ کے مشن کی زیادہ سے زیادہ خدمت۔

—— آپ سے گہری محبت اور وابستگی اور آپ کا غیر معمولی احترام۔

—— آپ کے احسان کا جواب احسان سے دینے کے لیے اپنی بیچارگی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے اس سے یہ دعا کرنا کہ اے اللہ تو ہی اپنے خزانۂ رحمت سے آنحضورؐ کے احسان کا جواب دے۔

یہی تیسری چیز ہے جس کو "درود" کہتے ہیں۔

آخر "درود" کے اس تصور میں کونسی نامعقولیت ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جائے یا اسے ملائی ڈھکوسلا کہہ کر شور مچایا جائے۔ یہ صریحاً ایک فطری ضرورت ہے۔ اس فطری ضرورت کا راستہ بند کرنے سے پہلے انسانی نفسیات میں اصلاح کرنی پڑے گی۔

عربی زبان میں اصل لفظ صلوٰۃ کا استعمال ہوا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی اسی طرح متعدد ہیں جس طرح دنیا کی ہر زبان کے بے شمار مصادر کے ہوتے ہیں۔ لیکن وہی معنی لیے جاتے ہیں جو موقع استعمال کے لحاظ سے عربی جاننے والوں کے ذہن میں بیٹھتے ہیں۔ پھر اس میں بھی کوئی بات انوکھی نہیں ہے کہ صلوٰۃ جب بندے کی طرف سے ہو تو اس کے اور معنی ہوں اور جب خدا کی طرف سے ہو تو اس کے دوسرے معنی لیے جائیں۔ اگر "تاب الی اللہ" کے معنی "رجع عن معصیتہ الیہ" ہونے کے ساتھ ساتھ اگر "تاب اللہ علیہ" کے معنی "غفر لہ و رجع علیہ بفضلہ" ہو سکتے ہیں تو کیا بیچیدگی ہے اگر صلوٰۃ کے بندے کی طرف سے ہونے کے معنی دعائے رحمت کرنے کے ہوں اور صلوٰۃ کے اللہ کی طرف سے ہونے کے معنی اللہ کے رحمت فرمانے کے ہوں؟

ملاحظہ ہو البقرہ آیت ۱۵۷ "الذین اذا اصابتھم ۔ ۔ ۔ اولئک علیھم صلوات من ربھم و رحمۃ" میں صلوٰۃ اور رحمت متقارب المعنی الفاظ کو حرف عطف سے جوڑا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ آیت ۱۶۱ "الذین کفروا و ماتوا ۔ ۔ ۔ ۔ اولئک علیھم لعنۃ اللہ ۔ ۔ ۔ اجمعین" میں مقابل کے ایک گروہ کے لیے "لعنت" کا بیان آتا ہے معلوم ہوا کہ دونوں طرف دو متغائر پوزیشن کے گروہ ہیں۔ ایک کے لیے ان کے رب کی طرف سے صلوٰۃ و رحمت ہے اور دوسرے کے لیے لعنت۔ کیا یہ موقع واضح نہیں کر دیتا کہ اللہ کی طرف سے صلوٰۃ ہو تو اس کا مفہوم رحمت نازل کرنا اور عنایت فرمانا ہوتا ہے۔ رہے ملائکہ اور انسان تو ان کے پاس تو خزائن رحمت ہیں نہیں کہ وہ رحمت بھیجیں اور عنایت فرمائیں وہ تو بہر حال رحمت کے خزانوں کے مالک ہی کے سامنے درخواست پیش کر سکتے ہیں۔ صلوٰۃ کا لفظ دعا کے معنی میں کثیر الاستعمال ہے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں۔

اب ایک چیز اور قابل حل رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک گروہ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ لفظ صلوٰۃ کے معنی ہی غلط بنا دیئے گئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ لغت دیکھیے، شروع سے آج تک جو تفاسیر قرآن کی لکھی گئی ہیں ان پر نگاہ ڈالیے۔ پورے دینی لٹریچر کو کھنگالیے، احادیث کے دفتر چھانٹیے اور ان ساری شہادتوں سے معلوم کیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ یا درود بھیجنے کے معنی اللہ تعالیٰ اور بندوں کی طرف سے کیا قرار پاتے

ہیں؟ اب یہ گروہ لغت، تفسیر، حدیث، تعامل امت اور علماء دین کے سارے کے سارے لٹریچر کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ تو اصل دین کے خلاف ایک سازش تھی۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اتنی بڑی سازش جب بھی شروع کی گئی ہوگی تو آخر اس پر کوئی نہ کوئی احتجاج علماء کے کسی نہ کسی گروہ نے کیا ہوگا؟ کوئی سر پھٹول ہوئی ہوگی کہیں اختلافی بحثیں چھڑی ہونگی، تو پھر اس کے آثار کہیں نہ کہیں سے آپ کو ڈھونڈھ کے لانے چاہئیں۔ یہی مظلوم درود "اللھم صل علی محمد"، تو خود نماز میں شامل ہے اور نماز سوسائٹی کے عملی تواتر سے ہمیں حاصل ہوئی ہے۔ اگر یہ بھی مشتبہ ہوگئی تو عملی تواتر بھی سند نہ رہا اور عملی تواتر سند نہ رہا تو قرآن کی صحت کو کس دلیل سے ثابت فرمائیے گا! آپ کو ریسرچ کر کے یہ واضح کرنا چاہیے کہ کب تک نماز اس درود سے خالی اور اپنی اصلی حالت پر قائم رہی، پھر کس وقت کونسے لوگ تھے جنہوں نے یہ پیوند اس میں لگایا؟ اس واقعہ پر امت میں کیا ردعمل ہوا؟

یا پھر کیا آپ اس سازش میں نعوذ باللہ خود صحابہ کرام کو بھی شریک کرتے ہیں؟ —— ہاں شاید یہ بات کہنے کی جرأت نہ ہو لیکن ذہن میں موجود معلوم ہوتی ہے۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں! اگر صحابہ کرام ہی کو اصل دین کا پتہ نہ چلا، یا پتہ چلا تو سہی، لیکن (نعوذ باللہ) اس میں تحریف کر ڈالی تو پھر تو سوال یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ "اب کسے رہنما کرے کوئی!" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی درکنار رکھ دیا، اس کے بعد صحابہ کرام، خلفائے راشدین، تابعین، تبع تابعین، ائمہ، فقہا، علماء سب کو ساقط الاعتبار قرار دے دیا، احادیث، دینی لٹریچر اور تاریخی ریکارڈ کو سازش بنا ڈالا۔ تواتر امت کو مشکوک ٹھہرا دیا، تو اب مسلمان کدھر جائے!

ان باتوں پر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ آپ خود محسوس کریں گے کہ یہ ہمارے دور کا ایک بڑا فتنہ ہے، کہ دین کی مسلمہ اور نہایت معقول اور واضح حقیقتوں کے بارے میں عام لوگوں کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر کے پھر کہا جاتا ہے کہ اصلی اور خالص دین تو صرف ہم سے مل سکتا ہے، ہم قرآن کا کھرا اور خالص دین پیش کرتے ہیں!

اجماعِ امت

سوال :- اسلامی ریاست میں قانون سازی کی ایک صورت اجماع بھی ہے مگر اس میں ہر شخص رائے دینے کا مجاز نہیں - اس فیصلہ میں ائمہ اور مجتہدین ہی شریک ہوتے ہیں - اگر یہ صحیح ہے تو ائمہ کے باہمی کسی ایک مسئلہ پر اتفاق کر لینے کو اجماع امت کیونکر کہا جا سکتا ہے اور کیا یہ طرز جمہوری ہے ؟

جواب :- اس مسئلہ کو سمجھنے میں جو الجھن دراصل آپ کو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہنی پس منظر میں تو غیر اسلامی نظام حیات اور اس میں علماء دین کی کمزور حیثیت ہے اور غور آپ اسلامی نظام پر کرتے ہیں - سوچ بچار کا یہ انداز ہر لحاظ سے غلط اور غیر منطقی ہے -

دنیا کی ہر ریاست اپنا ایک نصب العین رکھتی ہے اور اس کی ساری قوتیں صرف اسی کو حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہیں - اس عمل کا اثر حکومت کے سارے شعبوں پر پڑتا ہے اور ان میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے - اب آپ غور کریں کہ جب ایک حکومت اپنے آپ کو اسلامی نظام حیات کے مطابق ڈھالتی ہے تو کیا اس کا پورا ڈھانچہ اس کے مطابق تبدیل نہیں ہوتا - ظاہر بات ہے کہ ایسی حکومت میں وہی لوگ آگے آئیں گے جو کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھتے ہوں - یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ حکومت اسلامی ہو، اور اس میں اہل الرائے وہ لوگ ہوں جو اسلام کی تعلیم سے بالکل کورے ہوں - جس طرح ایک سرمایہ دارانہ جمہوری نظام میں ارباب حل وعقد وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس نظام پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے رمز شناس بھی ہوں - اسی طرح اسلامی حکومت میں وہی افراد نمایاں ہونگے جو دین سے زیادہ سے زیادہ وابستگی رکھنے کے علاوہ اس کو زیادہ سے زیادہ سمجھتے بھی ہوں - انتخاب کا جو منصفانہ طریق بھی اختیار کیا جائے گا مسلم سوسائٹی کا یہی مکھن اوپر آئے گا، اور یہی دراصل مسلم قوم کے دل کی دھڑکنوں کی صحیح طور پر ترجمانی کرے گا - اس کا ایک مسئلہ پر متفق ہو جانا پوری امت کے متفق ہونے کا مترادف ہو گا - دنیا میں آج تک کبھی ایسا

نہیں ہوا کہ کسی مسئلہ کے حل کرنے کے لیے ہر ہر فرد کو بلا لیا جائے، یا اس کی رائے لی جائے۔ قوم کے نمائندے ہی باہم سر جوڑ کر کسی ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے ہیں اور بالآخر یہی قوم کا متفقہ فیصلہ قرار پاتا ہے۔

قومی ملکیت

سوال :۔ اگر ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا کر اُسے نیک اور صالح افراد کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو کیا اس سے وہ سارے مفاسد دُور نہ ہونگے جو سرمایہ داری اور کمیونزم میں پائے جاتے ہیں۔؟

جواب۔ آپ کا یہ سوال اُس طرزِ خیال کی ترجمانی کرتا ہے جو ہمارے ملک میں کچھ عرصہ سے قوت پکڑ رہا ہے۔ کچھ لوگ نہایت سادگی سے اس کے طلسم میں گرفتار بھی ہو رہے ہیں۔ آپ ذرا ان کی منطق کو دیکھیے۔

- سرمایہ کو افراد کے ہاتھوں سے نکال کر قوم کی ملکیت میں دے دینا چاہیے۔
- کیوں ؟
- کیونکہ اس سے جو قوت افراد کو حاصل ہوتی ہے وہ انہیں ظالم جابر اور مستبد بنا دیتی ہے اور وہ کمزوروں کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بناتے ہیں۔

اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا یہ حماقت نہ ہوگی کہ پورے ملک کے سرمایہ اور ذرائع پیداوار کو چند لوگوں کے ہاتھوں میں دے جائے۔ کیا ان کی اپنی منطق کے مطابق یہ بے پناہ قوت انہیں زیادہ ظالم اور مستبد نہ بنائے گی۔ اس معاملہ میں اس طرزِ فکر کے لوگوں کی منطق بڑی نرالی اور دلچسپ ہے۔

آپ کے اس ارشاد کے متعلق کہ "کیا اس سے وہ سارے مفاسد دُور نہ ہونگے جو سرمایہ داری اور کمیونزم میں پائے جاتے ہیں" عرض ہے کہ خیر اور بھلائی تو اسلام کو اپنانے میں ہی ہے اور مفاسد کو

دُور کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو گا وہ سلامتی سے ہٹا ہوا ہو گا۔
اسلام جس طرح یکسر آزاد معیشت کے خلاف ہے اسی طرح ذرائع پیداوار کو بھی قومی ملکیت بنا دینے کا مخالف ہے۔ آپ اگر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آزادیٔ ضمیر، عزتِ نفس، خوداعتمادی ایسی صفات اسی صورت میں پرورش پاتی ہیں جب انسان کو اس امر کا احساس ہو کہ وہ روٹی حاصل کرنے کے لیے غلامی اختیار کرنے پر مجبور نہیں، اور اگر وہ چاہے تو خدا کی وسیع و عریض کائنات میں اپنے وسائلِ رزق آزادی کے ساتھ ڈھونڈھ سکتا ہے۔ کیا آپ پوری دنیا کو ایک جیل خانہ بنانے میں ہی انسانیت کی فلاح دیکھتے ہیں؟ (ا ع - ح)

بقیّہ اشارات

بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ یا مذہب کا قلادہ گلے سے نکال کر دنیا کے میدان میں پوری چھوٹ پا لیتا ہے۔
ان مذاہب کا یہ خلاء کہ یہ انسان کو دنیا میں اجتماعی زندگی کے سارے فرائض انجام دیتے ہوئے خدا سے نہیں ملا سکتے اور سیاسی و تمدنی مسائل میں کوئی مکمل رہنمائی بہم نہیں پہنچاتے، یہی اس کا موجب ہوا کہ تاریخی موانع پیدا ہو جانے پر "مذہبی طبقات" آگے بڑھیں، اس خلاء کو پُر کریں اور خدا اور مذہب کے نام پر اپنی مرضی کو مقدس ضابطہ بنا کر عوام الناس پر ٹھونس دیں۔ اس لحاظ سے تھیوکریسی کا ظہور ہمیشہ کسی مذہبی نظام کے اس نقص کا نتیجہ تھا کہ وہ دنیوی معاملات کے لیے رہنمائی نہیں دیتا تھا اور اس نظام کے زیر اثر آنے والے انسانوں کے لیے مذہب کی منظوری کے بغیر دنیوی معاملات چلانا طمانیتِ ضمیر سے محرومی کا موجب تھا۔ چنانچہ مذہبی طبقوں اور عام لوگوں میں یہ سودا ہوا کہ ہم تم کو دنیوی معاملات میں مذہب کی منظوری بہم پہنچائیں گے تم ہمارا اقتدار مانو۔ اس سودے نے مذہب (جیسا کچھ بھی رہا ہو) کا الگ ستیاناس کر دیا اور نظامِ تمدن کا الگ حلیہ بگاڑ دیا! یہ تلخ تجربہ اس انجام کو پہنچا کہ مذہبی طبقوں کے تسلط کے خلاف عام آدمی کو جنگ لڑنی پڑی۔ یہ جنگ خون خرابیوں کے بعد اس سمجھوتے پر ختم ہوئی کہ دنیا کے معاملات میں مذہب کا کوئی دخل

نہ ہوگا، اور مذہب کے امور میں اہل دنیا مداخلت نہیں کریں گے۔ دونوں کا دائرہ کار ایک خط تقسیم کھینچ کر الگ کر دیا گیا ہے۔ اسٹیٹ اور کلیسا نے زندگی کی جاگیر تقسیم کر لی۔ اجتماعی زندگی اسٹیٹ نے اپنے قبضے میں لے لی اور انفرادی اور نجی زندگی کلیسا کے حوالے کی گئی۔ یوں دین اور سیاست الگ الگ ہوئے۔

اس ساری تاریخ فساد کی اصل جڑ کیا ہے؟ —— مذاہب کا حقیقی انسانی ضرورت کا مکمل جواب نہ ہونا اور زندگی کی رہنمائی کی صلاحیت نہ رکھنا!

اسلام —— ان تمام مذاہب کے بالمقابل (خواہ وہ اسلام کی اصل ہیئت کو بگاڑ کر ایک نئی وضع پر لائے گئے ہوں، یا وہ خود انسانی ایجاد و اختراع کا نتیجہ ہوں) اپنے آپ کو ایک جداگانہ حیثیت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت کا جواب بن کے اُبھرا ہے، وہ تمام کے تمام دنیوی معاملات میں رہنمائی کی پوزیشن اختیار کر کے اپنی دعوت پیش کرتا ہے۔ وہ حالات و ضروریات اور نظریات و احساسات کے جنگل میں انسانی ارادہ و اختیار کے سامنے صحیح راستہ نکال دینے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ اس کی بغل میں خدا کا دیا ہوا —— نہ کہ کسی طبقے کا گھڑا ہوا —— ایک مستقل اور مقدس ضابطہ ہے۔

اسلام کا خدا نہ تو پتھر کا ایک بُت ہے، نہ کھیل تماشے رچانے والا شعبدہ گر ہے، نہ مخلوق کو عذاب میں ڈال کر لطف لینے والا کوئی عشرت پسند جبار راجہ ہے، اور نہ وہ ایک غیر ذمہ دار خالق ہے۔ وہ اپنی خلق کا خالق و رازق بھی ہے، اُن کا منتظم اور منصرم بھی ہے، اُن کا ہادی اور قانون ساز بھی ہے اور اُن کا فرماں روا اور حاکم بھی ہے —— واحد اور لاشریک فرماں روا اور حاکم! چنانچہ اسلام اپنے دروازے سے داخل ہونے کی شرط اوّل یہی قرار دیتا ہے کہ خدا کو اس کی ساری صفات کے ساتھ اپنی زندگی کا اِلٰہ مانو، اُسے حکم و اختیار کے لحاظ سے سب سے برتر مانو، اسے واجب الاطاعت ہونے کے لحاظ سے درجۂ اوّل پر رکھو، اس کے آگے پوری طرح گردن ڈال دو! تقاضا کیا جاتا ہے کہ اپنا سب کچھ لا کے اسی ایک اللہ کے حوالہ کر دو، اپنی قوتیں، اپنے اعضاء، اپنے اموال، اپنے اوقات! مطالبہ ہے کہ پوری کی پوری زندگی کا سودا چکالو، اور اس طرح چکالو کہ پھر دوسرے تاجروں اور دوسرے گاہکوں سے کوئی معاملہ کرنے کی

گنجائش باقی نہ رہے! اصرار ہے کہ زندگی میں تصرف کرنے کا حق خدائے واحد کے لیے اس حد تک خاص کردو کہ اس کے مقابلے میں کسی غیر کا تو کیا، خود تمہارا اپنا بھی کوئی حق باقی نہ رہے! بہ صد تکرار چاہا گیا ہے کہ ایک بار ادھر رُخ کر لو تو پھر ہر طرف سے مُنہ موڑ لو، ہر جانب سے آنکھیں پھیر لو، ایک ہی بارگاہ کی طرف یکسُو ہو جاؤ!

پھر رسولؐ کو سامنے لایا جاتا ہے تو اس حیثیت سے سامنے لایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا بھیجا ہوا نمائندہ خاص ہے، یہی ہے جس کے ہاتھ سے ضابطہ ملے گا، جس کی زبان الٰہی ہدایت کی ترجمانی کریگی۔ جو خدا کی مرضیات کی عملی تفسیر پیش کرے گا، جو مستقل اسوۂ حسنہ ہوگا۔ اس کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہوگی، اس سے معاملات میں رہنمائی لینی ہوگی، اس سے اختلافات ونزاعات میں آخری فیصلہ لینا ہوگا، اس سے امورِ حیات میں سند پکڑنی ہوگی، جو کچھ یہ طے کر دے کوئی دوسرا اس کی تنسیخ نہیں کر سکتا جسے یہ منسوخ کر دے اُسے کوئی دوسرا جائز نہیں ٹھہرا سکتا جسے یہ حرام کر دے وہی حرام ہوگا، جسے یہ حلال کر دے وہی حلال ہوگا۔ اس کا دامن تھام کے چلوگے تو اللہ کے دین پر کاربند ہو سکوگے۔

اسلام کا یہ ہے خدا، اور ایسا ہے اس کا رسولؐ کہ جن کی اتھارٹی اور سند سے جو ضوابط، جو اصولِ کار، جو قوانین اور جو احکام ملتے ہیں وہ ایک مسلمان کو مسلمان ہونے اور رہنے کے لیے پورے کے پورے قبول کرنے پڑتے ہیں۔ عقائد، عبادات، اخلاقی احکام اور اجتماعی زندگی سے متعلق قوانین و ضوابط سب کے سب مل کر ایک دین بنتے ہیں، جسے رد کرنے والے پورا رد کرتے ہیں اور قبول کرنے والے پورا قبول کرتے ہیں۔ یہاں کا تصورِ توحید اگر وحدتِ الٰہ کا عقیدہ دیتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ وحدتِ آدم اور وحدتِ حیات کا شعور بھی دیتا ہے۔ یہاں زندگی کی جاگیر کو خدا اور قیصر، کلیسا اور اسٹیٹ، مذہب اور سیاست کے درمیان بانٹنے کے لیے کوئی لکیر نہ کھنچی ہوئی ملے گی، نہ کھینچنے کی گنجائش!

یہاں تقسیم حیات کے معنی صریحاً شرک کے ہیں۔ یہاں زندگی کے کسی شعبے کو خدا کے حکم و اختیار سے نکال کر کسی دوسرے کے حوالے کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس شعبے میں خدائے واحد

کے بالمقابل ایک دوسرا خدا مان لیا گیا۔ یہاں کسی معاملے کو خدا کے رسولؐ کی تعلیم کی زد سے باہر رہے جاتے کا کوئی مطلب اس کے سوا نہیں لیا جا سکتا کہ رسولؐ کے مقابل کی ایک دوسری اتھارٹی مان لی گئی۔ یہاں کسی چیز کو کتاب الٰہی کے دائرۂ بحث سے خارج قرار دینا صرف ایک ہی نتیجہ دیتا ہے کہ کتاب الٰہی کے مقابلے میں کوئی دوسرا معیار فیصلہ برتر قرار دے دیا گیا۔ اسٹیٹ اگر اسلامی نظریے سے ہٹ کر کسی اور نظریے پر قائم ہوتا ہے اور وہ خدا و رسولؐ کے دین کو اپنی حدود سے دھکیل کر مساجد میں جا محبوس کرتا ہے تو اس اسٹیٹ کی نوعیت ایک طاغوت کی سی ہے۔

جس نظام میں دینِ برحق کا وہ جزوِ اعظم جو اجتماعیات سے متعلق ہے، معطل کر دیا جائے اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اس کے صرف اس جزء پر اکتفا کریں جو ذاتی اور نجی امور سے واسطہ رکھتا ہے تو اس سے دنیا کا خطرناک ترین تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تضاد ایک سوال یہ پیدا کرتا ہے کہ دین کا وہ جزو جو معطل کیا جا رہا ہے کیا خدا اور رسول کا دین نہ سمجھا جائے گا اور وہ بھی دین ہے تو کیا وہ موجبِ خیر و برکت اور واجب الاطاعت نہیں، بلکہ اس کی صرف تلاوت و قرأت کافی ہے؟ دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اگر زندگی میں بیک وقت دو اقتدار، دو نظریے اور دو الگ الگ ضابطے برسرِ عمل لائے جائیں۔ تو چاہے ان کے لیے کتنی ہی باریکی سے میدانِ کار تقسیم کیا گیا ہو دونوں کے تقاضوں میں تصادم ہوئے بغیر نہیں رہتا، ایسی صورت میں کونسی طاقت فیصلہ کن اور بالآخر قرار پائے گی؟ ظاہر بات ہے کہ اسٹیٹ "انا ولاغیری" کے دعویٰ کے ساتھ کام کرتا ہے تو فوج، پولیس، قانون، عدالت، خزانے، ریڈیو، نظام تعلیم کی ساری مؤثر طاقتوں کو جلو میں لیے جب یہ کوئی اقدام کرے گا تو "مذہب" کی مجال نہیں ہو سکتی کہ دم مار سکے۔ یوں جب فیصلہ کن طاقت اسلام کے مقابلے میں غیر اسلام ہو تو اسے تسلیم کر کے کوئی مسلمان کیسے مسلمان رہیگا؛ اس کے لیے تو ابتداء "نومن ببعض الکتاب و نکفر ببعض الکتاب" سے ہوگی اور انتہاء "نومن بغیرالکتاب و نکفر بکل من الکتاب" پر! پھر ایک عام سوال یہ نمودار ہوگا کہ خدا اور رسول کا جو دین اجتماعی زندگی کے وسیع اور پیچ در پیچ معاملات میں ذریعۂ ہدایت اور حلِّ مشکلات کی حیثیت میں کام

دینے والا نہیں رہا اُس کی اور ضرورت کیا ہے؟ کیا دوسرے انفرادی مذاہب کی طرح محض ضمیر کو تسکین اور روح کو مست کرنے کے لیے کلمہ کا ورد اور نماز روزہ کی عادت اور ذکر و تسبیح کے وظیفہ کو استعمال کر کے یہ امت اطمینان حاصل کر سکتی ہے کہ دین داری کا حق ادا ہو گیا؟ یہ اس لیے ممکن نہیں کہ یہاں کلمہ اور نماز روزہ اور ذکر میں سے جس جزو کو بھی لیجیے، خود ہر ایک کے اندر ایک اجتماعی نظام کا تصور پوری طرح جذب ہے۔ اور اسلام کے عقیدے اور اس کی عبادات خود بخود دین و سیاست کی وحدت کی طرف لے جاتی ہیں۔

پھر اس مصیبت کا کیا حل کہ جب آپ زندگی اور دین کو اس طرح پھاڑ دیتے ہیں کہ مذہب الگ ایک دائرے میں سکڑ جاتے اور سیاست مذہب کی مداخلت سے بے نیاز ہو کر میدانِ حیات میں جولانیاں دکھلائے تو اس سے معاشرہ دو طبقوں میں بٹتا ہے اور دونوں کے دونوں فساد زدہ ہو جاتے ہیں۔ جو طبقہ سیاست میں کارفرما بنتا ہے وہ بناؤ اور بگاڑ کے وسیع اختیارات تو پا لیتا ہے لیکن اس کے ذہن و سیرت کو کنٹرول کرنے والی کوئی طاقت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے ظلم اور خیانت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ دوسری طرف جب دین کے پیکر کو ہاتھ پاؤں اور پر پُرزے کاٹ کر آپ نے ایک لوتھ کی لوتھ بنا کے ڈال دیا تو بے بسی کے سارے نتائج مذہبی طبقے کو پیش آکے رہیں گے۔ اس طبقے میں تفرقہ آئے گا، اس میں انتشار پیدا ہو گا، اس میں ظرف کی محدودیت نمودار ہو گی، اس میں حوصلوں کی پستی آئے گی، یہ مذہب کو کاروباریت کے رنگ میں رنگے گا، یہ دربارداری اور قصیدہ خوانی اور کسی نہ کسی کی دامن برداری کے فتنوں میں مبتلا ہو گا۔ نہ خیر اُدھر رہے گی، نہ فلاح اِدھر ہو گی۔ اُدھر بھی فساد ہو گا، اِدھر بھی بگاڑ ہو گا۔ دونوں کا فساد اور بگاڑ خود معاشرے کے لیے تباہ کن ثابت ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی ایسے نظام کے تحت امن چین سے نہیں جی سکتے جو زندگی کو تقسیم کر کے دو طاقتوں اور دو نظریوں اور دو طبقوں کو وجود دیتا ہو۔

سوچنے کا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اجتماعی زندگی ہمیشہ ایک اساسی نظریے کی محتاج ہوتی ہے، اور آج جبکہ نظریات کی کشمکش کا دور ہے کسی بھی قوم کے لیے نظریہ و نصب العین کی طاقت کو ساتھ لیے بغیر معرکہ ہائے حیات سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں رہا، توڑ پھوڑ کے اس خاص دور سے سلامتی کے ساتھ وہی ریاستیں اور وہی معاشرے گذر سکیں گے جو نظریات و مقاصد کے بل پہ زندہ ہیں! اسلام ہمیں سیاست و تمدن کے لیے ایک بلند ترین نظریہ و نصب العین دیتا ہے جسے اگر مرکزی روح قرار دیا جائے تو ہماری ساری سرگرمیاں اس کے ذریعے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ اس سے ہمیں ایک اجتماعی طرزِ فکر اور ایک نقطۂ نظر ملتا ہے، وہ ہمیں ایک معیارِ فیصلہ فراہم کرتا ہے، وہ ترقی کے راستے پر ہماری رہنمائی کرتا ہے

اور وہ قدم آگے بڑھانے کے لیے ایک زوردار محرک داعیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاست کے دائرے سے اسلام کو نکال باہر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نظریہ و نصب العین کا ایک خوفناک خلا پیدا ہو جائے۔ یہ خلا جب اپنے پُر کیے جانے کا شدت سے تقاضا کریگا تو یا تو آپ کو سرمایہ داری کی دنیا سے نظریۂ وطن پرستی و قوم پرستی کو مستعار لینا پڑیگا، یا پھر اشتراکی نظریے کے لیے زندگی کے دروازے کھولنے ہونگے۔ وطن پرستی اور قوم پرستی سے اب دنیا آگے نکل آئی ہے، خود پاکستان میں ابتک اسکی کھپت کے کوئی آثار نہیں ہیں اور نہ آئندہ کے لیے کوئی توقع کی جاسکتی ہے۔ پھر یہ خلاء اگر برقرار رہے گا تو یہ کمیونزم کے لیے ایک مستقل دعوت ہوگا۔ عقلمندی یہ ہے کہ اسلامی نظریہ اختیار کرکے یہ خلاء باقی نہ رہنے دیا جائے۔

جی ہاں! قطع نظر آپ کی اس غلط بیانی سے، کہ دین گذشتہ تیرہ سو سال میں سیاست سے بے دخل رہا ہے، یہ بجا ہے کہ آج کسی ملک میں اسلامی نظام برسرِ عمل نہیں ہے۔ مگر اور بھی بہت سی مطلوب چیزیں ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتی رہی ہیں۔ اُن میں اتحاد نہیں رہا، ان میں ایک اصولی ہیئت اور ایک مقصدی تحریک ہونے کا شعور مرگیا ہے، اُن سے انسانیت کی رہنمائی کا منصب چھن چکا ہے، اُن کی تحقیق و ایجاد کی صلاحیتیں ٹھٹھر چکی ہیں، ان میں دوسروں سے مسابقت کا داعیہ برسرِ عمل نہیں رہا، ان میں کردار کی بلندی باقی نہیں، ان کی اخلاقی قدروں کی جڑیں سوکھ رہی ہیں، ان میں معاشی بدحالی پھیل چکی ہے، ان میں دوسروں کی غلامی نے بہت سی خرابیاں پیدا کردی ہیں۔ جس طرح ان سارے پہلوؤں میں سے کسی پہلو میں بھی اصلاح و تعمیر کی کوششیں اس دلیل سے لغو اور باطل نہیں ٹھہرائی جاسکتیں کہ چونکہ مدت سے یہی حال چلا آرہا ہے لہٰذا اب اسے کیوں بدلا جائے، یا چونکہ کوئی مسلمان ملک بھی آج کسی مطلوبہ نعمت سے مالا مال نہیں ہے، لہٰذا پاکستان ہی کیوں اس سے بہرہ مند ہو، اسی طرح اسلام کو بحیثیت ایک دین کے پوری کی پوری زندگی پر کارفرما بنانے کی کوشش کا بطلان اس دلیل سے نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح کی منطق اگر انسانی دنیا میں مقبول ہوگئی ہوتی تو نہ جمہوری انقلابات واقع ہوتے، نہ اشتراکی اور فسطائی نظام قائم ہوسکتے، نہ ہی پہلے سے چلی آنے والی کسی غلط اور نامطلوب صورتِ حالات کو بدلنے کا ارادہ کسی دل میں راسخ ہوسکتا۔

آخر مذہب و سیاست کو اسلامی نظریہ کے تحت ایک کرنے کی جس مثال کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں پہلے قائم کرنی ہی پڑیگی۔ خود ہی اسے روکنا اور پھر خود ہی کہنا کہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے لہٰذا اسے شجرِ ممنوعہ قرار دینا چاہیے، معقولیت کی ایک اونچی مثال ہے!!

Back Page Missing!

اسلامی قانون اور پاکستان میں اسکے نفاذ کی عملی تدابیر

(دوسرا ایڈیشن)

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا لیکن سات سال گذرنے کے بعد بھی ابھی ایک گروہ — بر سر اقتدار گروہ — اس ملک میں ایسا موجود ہے جو شرح صدر کے ساتھ اسلام کو اس ملک کی اساس بنانے کے لئے تیار نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دین کو سیاست سے کیا تعلق وہ تو صرف عبادات و عقائد کے معاملات میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا میں آج تک کسی ریاست کی بنیاد قرآن و سنت پر نہیں رکھی گئی۔ کوئی کہتا ہے کہ اگر پاکستان کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی تو اس ملت کے لئے تعمیر و ترقی کی راہیں مسدود ہو جائینگی۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے اسلامی قانون اور پاکستان میں اسکے نفاذ کی عملی تدابیر کے عنوان سے دو مقالات میں اس طرح کے تمام اعتراضات و شبہات کا مسکت جواب دیا ہے اور وہ تدابیر بتائی ہیں جن کے ذریعہ پاکستان کو ترقی یافتہ مثالی اسلامی مملکت بنایا جا سکتا ہے۔ ۸۸ صفحات قیمت ایکروپیہ

ذمیوں کے حقوق (نئی کتاب)

اسلامی ریاست پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسمیں تمام شہریوں کو یکساں حقوق نہیں دیئے جاتے اور غیر مسلموں کو ذمی قرار دیکر گویا اچھوت بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے اپنے مخصوص مدلل سلجھے ہوئے دلنشین انداز میں اپنے مضمون "ذمیوں کے حقوق" میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ذمیوں کے حقوق کی طویل فہرست پیش کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی ریاست میں بسنے والی اقلیتوں کو جو حقوق ملتے ہیں وہ دنیا کی موجودہ ریاستوں کی طرح محض کاغذ پر نہیں دیئے جاتے بلکہ انکے تحفظ کی ذمہ داری خود اللہ اور اسکے رسول نے لی ہے اور آج عملاً کسی اصولی ریاست میں اقلیتوں کو اتنے تحفظات حاصل نہیں جتنے اسلامی ریاست میں انہیں حاصل رہے ہیں۔ ۵۶ صفحات قیمت دس آنے

مسئلہ ملکیت زمین (دوسرا ایڈیشن)

ہمارا ملک چونکہ زراعتی ملک ہے اسلئے یہاں زمین کی ملکیت اور مزارعت سے متعلق نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں ایک گروہ کا خیال ہے کہ زمین کی انفرادی ملکیت ختم کرکے اسے "قومیا" دیا جائے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جاگیروں اور زمینداریوں کا وہی نظام برقرار رہنا چاہئے جو انگریز سے ہمیں ورثہ میں ملا ہے اور یہ دونوں گروہ اپنی تائید میں قران و سنت کا حوالہ دیتے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے کسی خاص نقطہ نظر کی تائید یا تردید میں قرآن و سنت سے دلائل لانے کے بجائے ملکیت زمین اور مزارعت کے بارے میں خالص قرآن و سنت کا نکتہ نظر پیش کیا ہے اور اسکی روشنی میں ان دونوں گروہوں کے نظریات پر تنقید کرکے صحیح راہ عمل متعین کی ہے۔ ۱۲۰ صفحات قیمت ایکروپیہ چار آنے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ - لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا